رجسٹرڈ نمبر ایل ۱۳۶۳

اُٹھو وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا
(ہمایوں)

بیادگارِ علامہ فضیلۃ آنریبل جسٹس میاں محمد شاہ دین صاحب ہمایوں مرحوم

اُردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ہمایوں

ایڈیٹر: بشیر احمد، بی۔ اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا
جائنٹ ایڈیٹر: حامد علی خاں، بی۔ اے

فہرستِ مضامینِ ہمایوں

بابت ماہِ جولائی ۱۹۳۲ء

تصویر

بحری سفر سے واپسی:-

یہ ایک قابل امریکن مصور کی تصویر ہے۔ ایک غریب گھرانا ہے۔ پکانے اور کھانے کا کمرہ ایک ہی ہے۔ نوجوان جہازران کی آمد سے جو اپنے پہلے بحری سفر کے بعد واپس آیا ہے گھر بھر خوش ہے۔ اس کے چھوٹے بھائی اس کے بحری تجربوں کا حال سن کر اس سے مرعوب نظر آتے ہیں۔ وہ شاید بھول گئے ہیں کہ یہ بھی محض ایک لڑکا ہی ہے۔ کرسی پر بیٹھے ہوئے بچے کے چہرے سے یہ بات زیادہ نمایاں طور پر ظاہر ہو رہی ہے۔ وہ اپنے بڑے بھائی کے بیگ کی تلاشی لینا بھول گیا ہے جس کو اس نے کچھ دیر پہلے شوخی سے اپنے گلے میں لٹکا لیا تھا۔ ننھی بچی اُن عجیب و غریب چیزوں کو دیکھ کر خوش ہو رہی ہے۔ جو اس کا بھائی دور دراز ملکوں سے اس کے لئے لایا ہے۔ نوجوان لڑکا اپنی سرد ماں کو سفر کے دل خوش کن حالات سنا رہا ہے اور بڑی لڑکی پکانا چھوڑ کر حریصانہ شوق کے ساتھ سفر کی باتیں سننے کو ادھر مڑی ہے۔

چندہ سالانہ للعہ معہ محصول — قیمت فی پرچہ ۶ ۔/ ۔ ویلر بک سٹال پر ۸ ۔/

ہمایوں کا دسواں سالگرہ نمبر

آنریبل نواب احمد سعید خاں صاحب آف چھتاری بالقابہ

میں اس کامیاب سالگرہ نمبر کی اشاعت پر آپ کو مبارک باد دیتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ نے اردو زبان کی خدمت کے لئے اپنی زندگی وقف کر رکھی ہے۔ اردو سے آپ کی محبت کا ثبوت "ہمایوں" سے بڑھ کر اور کیا ہوسکتا ہے۔ اردو زبان کے بہی خواہوں کو یقیناً آپ کے اس خاموش کام کی قدر کرنی چاہئے۔ ہمایوں کے ذریعہ سے اردو کی ترویج کے سلسلے میں سالہا سال سے آپ جو بے غرضانہ خدمات انجام دے رہے ہیں۔ وہ یقیناً شکریے کی مستحق ہیں۔

سر شاہ نواز بھٹو۔ کے ٹی۔ سی۔ آئی۔ ای۔ او۔ بی۔ ای۔ ایم۔ ایل سی (سندھ)

ہمایوں کا سالگرہ نمبر ملا۔ یہ اعلیٰ درجہ کا ادبی رسالہ ہے۔ اس کی ادارت کے فرائض نہایت خوش اسلوبی سے انجام دئے جاتے ہیں اور اس کی ظاہری صورت بھی قابل تعریف ہے۔ مضامین نظموں اور افسانوں کا معیار بلند ہے۔ اس کے گزشتہ و موجودہ مضمون نگاروں میں شرر، راشد الخیری، سر عبد القادر، حسن نظامی، اکبر، اقبال، جوش ملیح آبادی وغیرہ جیسے اساتذۂ فن کے نام شامل ہیں۔ یہ نام ہمایوں کے شاندار ماضی اور کامیاب مستقبل کے کفیل ہیں۔ میں آپ کو اردو زبان کی اس مفید خدمت کے انجام دینے پر مبارکباد دیتا ہوں کہ آپ نے ایک ایسا بلند مرتبہ علمی رسالہ جاری کر رکھا ہے۔

ڈاکٹر گوکل چند صاحب نارنگ ایم اے بیرسٹر ایٹ لا وزیر بلدیات پنجاب

آپ کو غالباً معلوم ہوگا کہ میں ہمایوں کے باقاعدہ پڑھنے والوں میں سے ہوں آپ کا سالگرہ نمبر نہایت دلچسپ اور بیش قیمت مجموعۂ علم و ادب ہے۔ مضامین مختلف النوع ہیں اور ان میں سے اکثر بہت بلند مرتبہ ہیں۔ ہمایوں کی نظمیں عموماً حقیقی شاعری کا عمدہ نمونہ ہوتی ہیں۔

میر غلام بھیک صاحب نیرنگ وکیل انبالہ

میں نے ہمایوں کی دہ سالہ خدمات کے متعلق آپ کا تبصرہ پڑھا اور آپ کو سچے دل سے اس مفید ادبی خدمت

بحری سفر سے واپسی پر

CALCUTTA
ART PG. WORKS
LAHORE

پرمبارک کا مستحق سمجھتا ہوں، ہمایوں نے گذشتہ دس سال کے اندر اردو نظم ونثر میں دلچسپ نفیس اور سبق آموز مضامین کا اضافہ کیا ہے۔ حسن وپاکیزگی کا یہ بلند معیار قائم رکھنا اور پستیٔ ذوق کا بازیچہ نہ بن جانا فی الحقیقت قابلِ تعریف ہے، بالخصوص ایک ایسے زمانے میں جب اس قسم کی ترغیبات کثرت سے موجود ہیں۔ وہ رسالہ جو ہمارے عظیم الشان رہبر، دوست اور فلاسفر کے محبوب ومحترم نام سے وابستہ ہو ہمایوں ہی کی طرح کا ہونا چاہئے تھا۔

میاں عبدالعزیز صاحب بیرسٹرایٹ لا صدر بلدیہ لاہور

میرے دل میں ہمیشہ سے ہمایوں کی قدر ہے۔ ظاہری محاسن کے لحاظ سے بھی یہ رسالہ بے نظیر ہے۔ مضامین سبق آموز اور بلند پایہ ہوتے ہیں۔ یہ رسالہ دل آزار مضامین سے آلودہ نہیں ہوتا اور میرے دل میں اس کی بہت قدر ہے۔ میں ہمیشہ اس رسالہ کو شروع سے لے کر آخر تک پڑھتا ہوں اور ہر مہینے اس کا منتظر رہتا ہوں۔ اس دفعہ کا سالگرہ نمبر بلاشبہ لاجواب تھا۔ میں ہمایوں کا باقاعدہ خریدار ہوں۔

جسٹس جے لال صاحب جج ہائی کورٹ پنجاب

ہمایوں بہت مفید رسالہ ہے اور ظاہری محاسن کے اعتبار سے بھی بہت نفیس ہے۔ آپ کی قابلیت سے یہی توقع تھی۔ میں اس کامیاب سالگرہ نمبر پر آپ کو اور آپ کے شرکائے کار کو مبارکباد دیتا ہوں۔

آنریبل حاجی عبداللہ ہارون ایم ایل اے (کراچی)

آپ ملک کی جو خدمت انجام دے رہے ہیں، اس میں خدا آپ کا مددگار ہو۔ مجھے یہ دیکھ کر مسرت ہوئی کہ یہ ہمایوں کا دسواں سالگرہ نمبر ہے۔ فی الحقیقت آپ کا یہ استقلال قابلِ تعریف ہے، میری خواہش ہے کہ ہمایوں ہر مہینے میرے نام آتا رہے۔

آنریبل ملک فیروز خاں صاحب نون وزیر تعلیم پنجاب

ہمایوں کا سالگرہ نمبر ملا اور اسے دیکھ کر مجھے بہت مسرت ہوئی۔

جہاں نما

میاں بیوی کے حقوق کا مسئلہ

پچھلے دنوں ایک انگریزی اخبار نے شوہروں اور بیویوں کو شادی کے متعلق اظہارِ خیال کی دعوت دی۔ ذیل میں مشہور انگریزی ادیب رابرٹ لنڈ اور مسز سلویا لنڈ کے خیالات درج کیے جاتے ہیں

میاں کا مسئلہ

از رابرٹ لنڈ

سوال

کیا آپ کو اس بات سے اتفاق ہے کہ اگر آپ کی بیوی آپ سے خوش نہ ہو تو وہ حسبِ مرضی آپ سے قطع تعلق کر لینے کا حق رکھتی ہے۔

کیا آپ تسلیم کرتے ہیں کہ ہر قسم کا کاروبار کرنے سیاسی مجالس میں شامل ہونے اور اپنے حسبِ پسند مذہب اختیار کرنے کا اسے حق حاصل ہے۔

جواب

اگر میری بیوی مجھے چھوڑ دے تو میں اس سے یہ نتیجہ نکالوں گا کہ یا تو میں ایک ایسا کندۂ ناتراش شوہر ہوں جس کو ہر بیوی چھوڑ کر بھاگ جائے گی اور یا وہ اتنی احمق بیوی ہے کہ وہ کسی شوہر کے پاس بھی نہ رہ سکے گی

دونوں صورتوں میں شادی کے تعلقات قائم رکھنا میں فضول سمجھوں گا۔

بیوی کا مسئلہ

از سلویا لنڈ

سوال

کیا آپ کے خیال میں بیوی اپنے ہر فعل میں آزاد اور مختار ہے۔

جواب

بیوی اُسی طرح آزاد ہے جس طرح کسی قسم کے اشتراک میں دو حصہ دار آزاد ہو سکتے ہیں۔ اگر دوراندیشی کے لئے نہیں تو کم از کم ازراہِ مروّت اُسے ہر ایسی بات میں اپنے شریک یا حصہ دار کی رائے اور مشورہ طلب کرنا چاہیئے جو حصہ دار پر اثر انداز ہوتی ہو۔ اگر مرد ایک جگہ جانا چاہے تو بیوی کو دوسری جگہ جانے پر اصرار نہ کرنا چاہیئے۔ اسی طرح بیوی کی کوئی سہیلی گھر پر آنے والی ہو اور شوہر اپنے دوستوں سے ملنے کے لئے باہر جانا چاہے تو اسے نہ روکنا چاہیئے۔ بعض باتوں میں شوہر کی رائے کا حصول محض برائے نام ہوتا ہے۔ ایسی باتوں میں اس

باقی رہا بیوی کا شوہر کو چھوڑنے کا حق اس کے
متعلق (مذہبی نقطۂ نظر سے الگ ہو کر بھی) میرا خیال یہ
ہے کہ اس بات کا فیصلہ بیوی کے اس فعل کے اُن نتائج
پر ہے جو دوسروں پر مثلاً اس کے بچّوں پر (اگر بچے
ہوں تو) اور شوہر پر اثر انداز ہونگے ظاہر ہے کہ کوئی انسان
نتائج سے بے پروا ہو کر خوش رہنے کا حق نہیں رکھتا
معیشت، مذہب اور سیاست میں بیوی کے
وہی حقوق ہیں جو شوہر کو حاصل ہیں۔

ایک "شاہ پسند" شوہر کے لئے یہ بات سخت
تکلیف دہ ہوگی کہ اس کی بیوی لوگوں کو بولشوزم کی
تعلیم دیتی پھرے۔ اسی طرح ایک بولشویک عورت
کے لئے صبح صبح چائے کی میز پر ماسکو کے متعلق اپنے
شاہ پسند شوہر کے تبصرے باعث کلفت ثابت
ہوں گے۔

مذہب کے معاملہ میں میاں بیوی کا اختلاف
خیال بلاشبہ ایک مصیبت ہے لیکن اگر یہ ایک دوسرے
کو جبراً اپنا ہم خیال بنانے کی کوشش کرنے لگیں
تو اور زیادہ فتنہ پیدا ہو جائے گا۔

سوال

کیا آپ کی بیوی کو حق حاصل ہے کہ وہ خود اپنے
مرد دوستوں کا انتخاب کرے بالخصوص آپ کی مرضی
کے خلاف؟ یا آپ کا خیال اس کے برعکس ہے یعنی اسے
آپ کے فیصلوں پر سر تسلیم خم کر دینا چاہئے۔

جواب

بیوی کو یقیناً یہ حق حاصل ہے کہ شوہر کے خلاف
کی بہتری کے لئے اس کی رائے نظرانداز کی جا سکتی ہے
مثلاً گھر کی آرائش کی تجدید وغیرہ کا وہ ہمیشہ مخالف ہوگا
ایسی صورت میں اس سے بحث وغیرہ نہیں کرنی چاہئے
بلکہ اسے پرسکون غفلت میں پڑا رہنے دینا چاہئے یہاں
تک کہ کام کرنے والے آکر دروازہ کھٹکھٹانے لگیں۔

سوال

کیا آپ کے خیال میں آپ کے شوہر کو حق
حاصل ہے کہ وہ خاتون دوستوں کا انتخاب آپ کی طرف
سے کسی اعتراض کے بغیر کرلے اور آپ کے علم کے بغیر
تھیٹروں اور ہوٹلوں میں اُن کو تفریح کے لئے لے جائے

جواب

جب شوہر خاتون دوستوں کو انتخاب کرنے
لگے اور ان کو ہوٹلوں میں کھانا کھلانے لگے اس کے دل
میں اپنی بیوی کی محبّت باقی موجود نہیں ہوتی۔ ایسی صورت
میں بیوی یا تو اپنے رشک و حسد کا نہایت جوش کے
ساتھ اظہار کرے گی اور شادی کا تعلق جلد منقطع ہو جائے
گا۔ اور یا خاموشی سے مصیبت برداشت کرے گی اور شاید ان کا تعلق اور بھی زیادہ سرعت سے
منقطع ہو جائیگا۔ میرے خیال میں اگر کوئی شوہر اپنی کسی دوست
کو ہوٹل میں دعوت دینا چاہے تو ایسی صورت میں بہتر
یہ ہے کہ یہ بات بیوی کو معلوم نہ ہو یہاں کامل فریب کی
ضرورت ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ شوہر اپنے آپ
کو ذلیل محسوس کرنے اور تکلیف برداشت کرنے پر طیار
ہو جائے۔

بعض اوقات بیوی میاں کی اس قدر گرویدہ
ہوتی ہے کہ وہ اُس کی خوشی کو اپنی خوشی پر ترجیح دیتی

کے باوجود مردوں اور عورتوں میں سے اپنی مرضی کے مطابق دوستوں کا انتخاب کرے لیکن مجھے اس میں شبہ ہے کہ ایک معمولی کامیاب شادی میں بھی عورت یہ طرزِ عمل اختیار کرنا مناسب سمجھے۔ اگر کسی میاں بیوی کو محسوس ہو کہ دوستوں کی پسند میں ان کے درمیان زیادہ اشتراک نہیں رہا۔ تو انہیں جلد ہی یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ وہ اب ایک دوسرے کو بھی کچھ زیادہ پسند نہیں کرتے۔ اس بات کا جواب کہ بیوی کو مرد دوستوں کے انتخاب میں میاں کے فیصلوں پر سرِ تسلیم خم کرنا چاہئیے یا نہیں اس بات پر منحصر ہے کہ بیوی احمق ہے یا نہیں اگر وہ احمق ہے تو وہ شوہر کا فیصلہ نہ مانے گی حالانکہ اسے ماننا چاہئیے۔ اگر وہ احمق نہیں تو اس صورت میں وہ خود بھی شوہر کی طرح فیصلہ کرنے کی اتنی ہی اہل ہوگی جتنا شوہر

سوال

کیا آپ کے خیال میں صرف مرد ہی گھر کا مالک ہوتا ہے اور گھر کے تمام معاملات کا فیصلہ اس کے ہاتھ میں ہونا چاہئیے۔ مثلاً گھر میں کتنا خرچ ہو۔ بیوی کپڑوں پر کتنی رقم صرف کرے وغیرہ

جواب

مجھے یقین ہے کہ میں کبھی اپنے گھر کا مالک نہ ہوں گا اگر اس کے لئے خانہ داری کے خرچ کے فیصلے بھی ضروری ہیں۔ مجھے ان باتوں کے متعلق کچھ معلوم نہیں۔ میں تو شکر اور آٹے کا بھاؤ بھی نہیں جانتا۔ اگر کوئی غیر معمولی صبر و تحمل والی عورت ان باتوں کا ذمہ لینے پر آمادہ ہو تو سب سے اچھی بات یہ ہے کہ بنک میں ؎

ہے۔ اس صورت میں تعلقات نہایت ہموار رہتے ہیں اور شوہر کو اخفا یا بیوی کے سامنے ندامت کا اظہار نہیں کرنا پڑتا۔

اگر (جیسا کہ اکثر ہوتا ہے) بیوی کے دل میں شوہر کی محبت باقی نہ رہی ہو تو اسے کچھ پروا نہیں ہوتی کہ شوہر نے کس کو ڈنر پر مدعو کیا ہے۔ وہ یہ خبر خندہ پیشانی سے سن سکتی ہے۔ مگر اس صورت میں بھی خاتون دوست کے لئے لنچ کی دعوت ڈنر کی دعوت سے زیادہ آرام دہ ثابت ہو سکتی ہے۔

سوال

کیا آپ کے خیال میں شوہر گھر کا مالک ہے اور اس کے ہر فیصلے کو ماننا آپ کا فرض ہے۔

جواب

یہ سوال کہ مالک کون ہو اس کے متعلق میرا خیال ہے کہ تمام عورتیں گڑیاں یا کھلونے بن کر رہنے کی آرزومند ہوتی ہیں لیکن شومئی اتفاق سے مردوں کی بھی یہی آرزو ہوتی ہے۔

؎ مشترک حساب کھولا جائے اور بیوی بھی چیک پر دستخط کرنے کا اسی طرح حق رکھتی ہو جس طرح شوہر۔ میرا خیال ہے کہ روپیہ ختم ہونے پر بنک کے مینجر کا انتباہ اس سے قبل پہنچ جائے گا کہ سنبھلنے کا وقت گذر جائے۔

بچوں کو آزار دینے والے

جانداروں پر تجربات کرنے کا سب سے بُرا پہلو یہی ہو سکتا تھا کہ نام نہاد علمی اغراض کے لئے انسانوں کو عقوبت دی جائے خدا ترس ڈاکٹروں کو مدت سے اس بات کا اندیشہ تھا چنانچہ اب واقعی بعض محققوں نے اپنی یہ مجنونانہ مہم بےکس بچوں کو نہایت جرأت سے آزار دینے کے ساتھ شروع کی ہے۔ علم النفس کے ایک بہت بڑے پروفیسر ڈاکٹر جان واٹسن نے اس کے متعلق حسب ذیل بیان دیا ہے۔

"ابتدا میں ہم اس قسم کے تجربے کرنے سے گریزاں تھے لیکن مطالعہ وتحقیق کی ضرورت اتنی اہم تھی کہ آخر کار ہم نے فیصلہ کیا کہ ایک بچہ کے دل میں خوف پیدا کر کے دیکھیں۔ سب سے پہلے ہم نے تجربہ کے لئے البرٹ نامی ایک بچہ لیا جس کا وزن ۱۱ مہینے کی عمر میں اکیس پاؤنڈ تھا۔ یہ ایک حیرت انگیز طور پر اچھا بچہ تھا۔ جتنے مہینے ہم اس پر تجربے کرتے رہے ہم نے اسے کبھی روتے نہ دیکھا، البتہ ہمارے تجربوں کے بعد وہ رونے لگا۔"

ان لوگوں نے البرٹ کو کیسے رلایا۔ یہ ایک دلخراش داستان ہے۔ ایک سفید چوہا جس سے البرٹ ہفتوں کھیلتا رہا تھا اس کے سامنے رکھا گیا وہ گھٹنیوں چل کر چوہے کے پاس آیا۔ جونہی البرٹ نے چوہے پر ہاتھ ڈالا اس کے سر کے پیچھے لوہے کی ایک سلاخ سے ضرب لگائی گئی۔ بچہ خوف سے یکدم اچھل کر نیچے گر پڑا اور چٹائی میں اپنا سر چھپانے لگا۔ مگر اس وقت بھی وہ نہ رویا البتہ دوسرے تجربے کے وقت وہ سسکیاں لینے لگا اور بالآخر رونے لگا۔ پانچویں دن وہ ہر اُس چیز سے خوف زدہ ہو جاتا تھا جس کے ساتھ وہ پہلے کھیلتا رہا تھا البرٹ پر اس سے زیادہ تجربے نہ ہو سکے کیونکہ اسے منضافاتی علاقے کے کسی خاندان نے لے پالک بنا لیا۔ اُس بچے کا خیال کرو جو ان خدا ناترس سائنسدانوں نے بچے کی فطرت میں پیدا کرنے کی کوشش کی خوف کے جذبات کا یہ نشوونما اُس کی ساری زندگی کو غارت کر دینے والا تھا۔

اس کے بعد اور بچوں پر تجربے کئے گئے جن کی عمر تین مہینے سے لے کر سات سال تک کی تھیں بچوں کو دق کرنے والے تجربوں میں سانپوں کا استعمال بھی کیا جاتا ہے۔ واٹسن کہتا ہے کہ جونہی میں بچے کو سانپ دکھاتا ساتھ ہی میں ایک نہایت خوفناک آواز نکالتا جس سے بچہ پوری طرح سہم کر نیچے گر جاتا۔ مطلب یہ تھا کہ آئندہ بچے سانپ کی صورت دیکھتے ہی اس طرح سہم جائیں۔

اس کے علاوہ آگ سے بھی تجربے کئے جاتے ہیں۔ بچے کی انگلیاں آگ سے جلائی جاتی ہیں تاکہ یہ ثابت کیا جائے کہ اس قسم کا بچہ آگ سے ڈرنے لگتا ہے لیکن کسی شیطان سیرت کے سوا ایک ننھے بچے پر اور کون تجربے کر سکتا ہے۔ کہتے ہیں کہ نوزائیدہ بچوں کے ذریعہ سے خوف کے ردِ عمل کا مطالعہ بہت اچھی طرح سے ہو سکتا ہے، بالخصوص جب وہ سو رہے ہوں۔ اگر اس وقت وہ گرا دیئے جائیں تو ردِ عمل عموماً ظاہر ہو گا۔"

خوش قسمتی سے اب اکثر سائنسدان ان ظالمانہ تجربوں کو بےسود خیال کرنے لگے ہیں وہ کہتے ہیں کہ اس قسم کے تجربوں سے کبھی کوئی نئی بات معلوم نہیں ہوئی۔ بہتر یہ ہے کہ انسان بصیرت، فکر اور دماغی قوتوں سے کام لے، لنڈن کے ایک مضمون نگار نے سنڈے ایکسپریس میں ان تجربوں کے متعلق اظہارِ خیال کرتے ہوئے حسبِ ذیل الفاظ لکھے ہیں:۔

"میں ان بچوں کو آزار دینے والوں سے دعوے کے ساتھ کہتا ہوں کہ وہ بچوں کو ستانے کے بجائے ہمیں اپنے آپ کو ستانے کی اجازت دیں۔ اگر لوہے کی ایک سلاخ ہو اور واٹسن پر مجھے پورا اختیار مل جائے تو میں ایک ہفتہ میں اس کا مرض دور کر دوں گا پھر آپ دیکھیں گے کہ وہ بےبس بچے سے زیادہ دور اچھل کر جاتا ہے۔ میں اس پر اس زور کے تجربے کروں گا کہ وہ خود سوچ میں پڑ جائے گا۔ اس کے ساتھ ہی میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ تجربہ خانے میں جو نوٹ میں لکھوں گا وہ اُس کے ہذیانات سے زیادہ دلچسپ ہوں گے۔"

کیا مذہب غیر ضروری ہے

لاہوری معاصر "سن رائز" نے بعض اکابر سے عنوان بالا کے متعلق اظہار رائے کی درخواست کی۔ ذیل میں ہم ان کے جوابات کے اقتباس درج کرتے ہیں۔

ڈاکٹر ای۔ ڈی لوکس پرنسپل ایف سی کالج لاہور

مسیح کے قول کے مطابق مذہب خدا کی اور انسان کی محبت کا نام ہے۔ اگر خدا نہ ہو تو اخلاقی قوانین کی پابندی پر کوئی مجبور نہیں رہ سکتا۔ اس صورت میں انسان کی آئندہ ترقی کی کوئی امید نہیں۔ آخر کیوں کوئی صداقت نیکی اور ضمیر کی خاطر مصیبتیں جھیلے۔ اس ضمن میں روس کی مثال پیش کی جاتی ہے لیکن یہ تجربہ ابھی اتنی ابتدائی حالت میں ہے کہ اس کی بنا پر کوئی فیصلہ نہیں ہو سکتا۔ اس ترقی یافتہ دور میں مذہب کو غیر ضروری قرار دینے والوں کی مثال وہی ہے کہ کوئی شخص چھت پر پہنچ کر زینہ کو غیر ضروری چیز سمجھنے لگے۔ آج کل کی تمام ذہنی اور اخلاقی ترقیاں مذہب ہی کی شرمندۂ احسان ہیں اب تک ہمارے سامنے کوئی ایسی مثال نہیں کہ کسی ملحد جماعت نے دیر تک زندہ رہ کر ترقی کی ہو بلاشبہ بعض نہایت قابل اور قوی سیرت لوگ مذہب کے منکر ہیں لیکن ان کی پرورش اور تربیت بھی مذہب پرست سوسائٹی ہی میں ہوتی رہی ہے۔ خدا کا خیال انسان کے دل سے نکال کر دیکھو یکدم تمام زنجیریں ٹوٹ جائیں گی اور اخلاق اور تہذیب کا نام و نشان نہ رہے گا۔

سر جوگندر سنگھ وزیر زراعت پنجاب

مذہب کا مفہوم مختلف لوگوں کے نزدیک مختلف ہے مذہب خدا کے ساتھ بلا واسطہ تعلق روح کی بقا اور اعمال نیک و بد کے مطابق دوسری دنیا میں زندگی کے تسلسل کا نام ہے۔ جب تک انسان کی فطرت کلیتہً منقلب نہ ہو جائے مذہب کی ضرورت ساقط نہیں ہو سکتی۔ سائنس کی ترقی کے ابتدائی دور میں مذہب سے بیگانگی کا خیال پیدا ہوا تھا لیکن موجودہ دور میں جب سائنس بہت ترقی کر چکا ہے بڑے بڑے سائنس دان مذہب کی حقانیت کے قائل نظر آتے ہیں۔ وہ سائنس کو محدود علم سمجھتے ہیں اور اس سے ماورا کوئی روشنی تلاش کرتے ہیں جب تک انسان ہے مذہب اس کے ساتھ رہے گا۔ کیونکہ یہ انسان کے ساتھ ہی پیدا ہوا تھا۔

میاں احمد یار خاں دولتانہ ایم ایل سی

مذہب کا لفظ یا یہ الفاظ صحیح تر اس کے مفہوم کی تشریحات گمراہ کن ہیں۔ میرے نزدیک اخلاقیات کا ہر دستور مذہب ہے۔ کوئی اخلاقی دستور جو انسانی جماعتوں کے درمیان صلح و آشتی اور امن کے قیام کا ضامن ہو مذہب ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ انسان اپنے اور اپنے ملک و قوم کے جائز حقوق کو پامال نہ ہونے دے وہ تمام احکام و قوانین خواہ وہ کسی بادشاہ کی طرف سے نافذ ہوں یا کسی پیغمبر کی طرف سے جن پر سوسائٹی کی رضامندی کی مہر ثبت ہو ایک ہی مقصد رکھتے ہیں اور یہ مقصد ذاتی اور جماعتی مفاد کی حفاظت ہی ہے جب تک انسان میں نفوق پرستی بلند نظری عیش طلبی اور ہوسناکی باقی ہے اس پر کسی نہ کسی قسم کی قید کا رہنا ضروری ہے یہ قید کہیں خدا کی صورت میں ہوتی ہے اور کہیں قانون کی صورت میں دوسری صورت میں وہ روحانی تسکین نہیں ہوتی جو پہلی صورت میں ہے واشنگٹن نے سچ کہا ہے کہ مذہب عقل و استدلال کے لئے ویسا ہی ضروری ہے جیسی مذہب کے لئے عقل و استدلال یہ بھی کہا گیا ہے کہ اگر خدا نہ ہوتا تو بھی انسان ایک نہ ایک خدا کا تصور کرنے پر مجبور ہوتا۔ انسان مذہب کو مٹانے کی کوشش کر لے کچھ حرج نہیں وہ صرف ان اوہام کو مٹائے گا جو مذہب کے نام سے پھیلے ہوئے ہیں اصلی چیز یعنی حق پرستی اور دیانتدارانہ زندگی کبھی مٹ نہیں سکتی۔

مس رشیدہ ذکا اللہ بی۔ اے

مذہب رسم پرستی کا نام نہیں۔ خدا اور بقائے روح کے سچے اعتقاد کا نام مذہب ہے۔ انسان مذہب کے ساتھ اسی طرح وابستہ ہے جس طرح زندگی کے ساتھ چشم بصیرت کے لئے چھوٹی چھوٹی چیزوں میں خدا کا جلوہ موجود ہے۔ جو لوگ مذہب کے منکر ہیں فی الحقیقت وہ بھی سچے مذہب پرست ہیں۔

مستقبل کا مذہب کیا ہوگا؟

گذشتہ بیس پچیس سال کے عرصے میں مادّی و روحانی حیثیت سے دنیا نے ایک انقلابِ عظیم دیکھا ہے۔ اور تقریباً دس سال سے تو ایسی ایسی تبدیلیاں رُونما ہو رہی ہیں کہ دنیا کی تاریخ میں اس سے پہلے کہیں اُن کی مثال نہیں ملتی۔ لیکن ابھی اس جادۂ انقلاب کی منزل نہیں آئی۔ ابھی ہم برابر بڑھتے چلے جا رہے ہیں، اور ہر قدم پر ہماری رفتار پہلے سے تیز تر ہو رہی ہے۔ مفکّرین آئے دن ہماری تعلیم، ہمارے مذہب، ہماری معاشرت ہماری ایجادات کے متعلق بڑی بڑی پیشین گوئیاں کرتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے اس صدی کے اختتام سے پہلے پہلے ہم چاند میں پہنچ جائیں گے۔ کوئی کہتا ہے وہ زمانہ دور نہیں جب ہمارے ملک کے ایک ایک گھر میں بجلی اس قدر عام ہو جائے گی کہ تمام خانگی کام اس کے ذریعہ سے سرانجام ہو سکیں گے۔ ہم دنیا بھر کے گانے اپنے گھر بیٹھے سنیں گے، اور اپنے ٹیلیفونوں پر اپنے دُور افتادہ عزیزوں کے پیغامات وصول کرتے ہوئے اُن کو دیکھ بھی سکیں گے۔ ہماری عمریں بڑھ جائیں گی اور مرض کا نام شاذ و نادر ہی کہیں سنائی دے گا۔ مرد اور عورتیں ایک ایسی آزادی کے ساتھ آپس میں ملیں جلیں گے جو علم اور توازنِ دماغ سے پیدا ہوگی۔ انسان پرندوں کی طرح آسمان کی فضا میں اُڑتے پھریں گے۔ آج دولت کو اور اُس طاقت کو جو دولت سے حاصل ہوتی ہے امتیاز کا نشان سمجھا جاتا ہے لیکن وہ دن آرہا ہے جب عقل، مروت اور جسمانی کمال کو بلند ترین درجہ حاصل ہوگا۔ ملکی حدود اور عزیز کی دوسری رسموں کو لوگ بھول جائیں گے، کیونکہ تمام دنیا ایک ہی ملکِ عظیم بن جائے گی۔

ایک انگریز مصنف مسٹر لیونارڈ ہینسلو نے انہیں تبدیلیوں کے متعلق ایک کتاب لکھی ہے جس میں انہوں نے اپنے چند سوالات پر موجودہ زمانے کے پچاس کے قریب نوجوان مشاہیر کے اقوال درج کئے ہیں۔ اُن کا پہلا سوال ہے "مستقبل کا مذہب کیا ہوگا؟" اُن کی کتاب میں سے فی الحال ہم اسی موضوع پر کچھ انتخاب کر رہے ہیں۔ جوابات کو پڑھ کر ناظرین خود اندازہ کر لیں گے کہ وہ کیسے آزاد، پُر امید، لطیف اور زندگی و مستقبل کو سوچ سمجھ کر دئے گئے ہیں۔

مسٹر ہوریس نکوس:-

میرا خیال ہے کہ آئندہ مذہب حفظانِ صحت کا مذہب ہوگا۔ ہم۔ ... مانی امراض کو گناہ اور جسمانی صحت کو ثواب

سمجھیں گے۔ غذا، ورزش اور سورج کی روشنی میں جس زبردست دلچسپی کا اظہار کیا جارہا ہے اُس کا مطلب یہی ہے۔ آج کل جو لوگ غذا کے مسئلے پر زور دے رہے ہیں اُن کا درجہ کل پیغمبروں کے قریب ہوگا۔

اس کی وجہ کہ آج تک یہ مذہب کامیاب کیوں نہیں ہوگیا یہ ہے کہ ابھی ہم نے خوف کے چنگل سے نجات حاصل نہیں کی۔ اگر ہم دوسری دنیا کے عیش و عشرت کی امید کو دل سے نکال سکیں تو یہ دنیا رہنے کے لئے ایک بہترین جگہ بن سکتی ہے۔

مجھے پختہ یقین ہے کہ مستقبل کے مبلغ کی تعلیم یہ ہوگی کہ پھل کثرت سے کھاؤ۔"

مس سٹارم جیمس:۔

مجھے امید ہے کہ آئندہ مذہب کا مطمح نظر انسانیت ہوگا۔ اس میں آدمی پر دو پابندیاں عائد ہونگی۔ اپنے لئے یہ کہ وہ اپنے آپ کو ایسے طرز عمل سے روکے جو اسے انسان کی پاکیزگی کے عقیدے سے منحرف کرنے والا ہو اور دوسروں کے لئے یہ کہ "اگر ہمارا ہمسایہ اپنے آپ کو اپنے طریق پر مسرت اندوز کرنا چاہے تو ہم اسے عیب بین نگاہوں سے نہ دیکھیں اور نہ برُے الفاظ سے یاد کریں"۔ اختیار مذہب کا نچوڑ ہے، مجھے امید ہے کہ آئندہ مذہب کا اختیار اپنی ذات کے لئے اپنا عائد کیا ہوا ہوگا۔

مارکوئیس آف ڈونیگل:۔

جس طرح آج مفکرین بعض مذہبی عقاید کو انسانی عقل و فکر کا نتیجہ قرار دے رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ یہ ایک ایسے زمانے میں وضع کئے گئے تھے جب دنیا نے ابھی زیادہ ترقی نہ کی تھی، اسی طرح آئندہ مذہب انسان کے وضع کئے ہوئے اُن تمام اوہام سے مبرا ہوگا جن کا آج دور دورہ ہے۔ موجودہ زمانے میں مذہب کا اعتقاد اوہام میں اس لئے ہے کہ عوام نے اپنے آپ سوچنا ابھی شروع ہی کیا ہے۔ مسیح اور دوسرے بڑے بڑے مذہبی پیشواؤں کی تعلیم کی بنیادی صداقتیں ہر زمانے کی ذہنیت پر راست آسکتی ہیں اور آئیں گی، لیکن پادریوں اور ملّاؤں نے صدیوں سے انہیں تصنع اور تصرف کے جس پردے میں لپیٹ رکھا ہے وہ عام روشنی کے زمانے میں اٹھ کر رہے گا۔ ہم مسیح کی پیدائش، قیامت اور معجزات کے فوائد و نقصانات پر بحث کرنا چھوڑ دیں گے ایسے مسائل اہم نہیں سمجھے جائیں گے، اور آئندہ مذہب صرف بنیادی سچائیوں اور اُن اعیان پر مشتمل ہوگا جن پر دنیا کے بڑے بڑے مذاہب کی تعمیر کی گئی ہے۔

مسز سیسل بیٹن:۔

اگر یہ حقیقت نہ ہوتی کہ اکثر لوگ بڑے بے ہمت واقع ہوئے ہیں اور حفاظت جماعت ہی میں مضمر ہے تو میرا خیال یہ ہوتا کہ آئندہ ہر شخص کا اپنا مذہب اور اپنا اخلاقی مسلک اور قانون ہوگا، لیکن یوں شاید معیّنت

کے اوقات میں اُن پر ایسی ہیبت چھا جایا کرے گی کہ وہ اپنے بے مہار معیاروں کے مطابق ایک عذاب الیم میں مبتلا ہو جائیں گے۔

مس دل فنے ومور یئے:۔

میرا خیال ہے کہ آہستہ آہستہ مذہب ایک شخصی معاملہ ہو جائے گا، جس کا دستور اور روایت سے کوئی تعلق نہ ہوگا۔ مذہب کے دستور اور اقتدار کی جگہ انفرادیت کا عالمگیر عقیدہ لے گا۔ انسان جماعت وارانہ تعلیم کے خلاف بغاوت کرے گا اور اپنے ضمیر کی ہدایت پر جادہ پیما ہوگا۔ وہ نیکی اور بدی میں تمیز کرے گا، عقوبت کے قدیم خیال سے ڈر کر نہیں بلکہ اپنے اُس حاصل کردہ علم سے جو بتاتا ہے کہ اُس کے لئے کونسی بات بہتر ہے۔

لارڈ برنرز:۔

آئندہ خواہ کوئی مذہب بھی ہو ایک بات یقینی ہے۔ یہ دانشمند انسان کا مذہب نہ ہوگا۔

جدید مذہب عوام کے لئے بنے گا۔ اور ہم سب جانتے ہیں کہ عوام کے لئے کس قماش کی چیزیں وضع کی جاتی ہیں۔

مسٹر انتھونی ایم لوڈوویسی:۔

یہ حسب دستور عوام کے لئے ایک قسم کا مجموعۂ اوہام ہوگا، اور تعلیم یافتہ طبقے کے لئے ایک ایسے خدا کی پرستش پر مبنی ہوگا جس کی تعریف کائنات اور فطرت کے اُن تمام مسائل پر حاوی ہو جائے گی جسے اُس زمانے کی سائنس حل نہ کرسکی ہو جس سرعت سے سائنس اسرار کا پردہ ہٹاتی جاتی ہے قائلینِ خدا معمول کے مطابق اپنی اللہیت کی تائید کے لئے زندگی اور کائنات میں نئے اسرار معلوم کرتے جاتے ہیں۔

مسٹر ڈی جی اے لو:۔

انسان کی فطرتی خواہش یہ ہے کہ وہ کسی خدا کی پرستش کرے۔ بتشکک سالہا سال کے دیانت دارانہ شک کے بعد جسے علمی تحقیق و تفتیش نے پیدا کیا ہو۔ اکثر خدا کا قائل ہو جاتا ہے۔ مذہب پر تباہی اُن سست اور کاہل لوگوں کی طرف سے آتی ہے جو سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کر سکتے اور جو عموماً گوسالۂ سامری کے پرستار ہوتے ہیں، لیکن اُن کے دل میں بھی اکثر یہ فطرتی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ جس اللہیت کے ہم قائل ہیں آنے والی صدیوں کے لئے اُس کی شکل بدلنی ضروری ہے۔

مسٹر جان سٹریچی، ممبر پارلیمنٹ:۔

مجھے کچھ اندازہ نہیں، ممکن ہے کہ بیسیوں مذہب ہوں، لیکن ایک رجائی ہونے کی حیثیت سے میں اُس وقت کا منتظر ہوں جب انسان فوق فطرتی التباسات کے بغیر زندگی کو برداشت کرنے کے قابل ہوگا۔

مس آئیرس بیری :-
لفظ مذہب کے اگر عام معنی لئے جائیں تو میں یہ خیال کہنے کو ترجیح دوں گی کہ آئندہ کوئی مذہب نہ ہوگا، اور یہ کہ انسان نادیدہ اور ڈراونے ہوّوں سے نیکی کا سودا کرنا چھوڑ دے گا۔

مسٹر مارس لین نارکاٹ :-
پاپ پوجا، میرا خیال ہے۔

جے اے بانڈ کارپنٹر (صدر آکسفورڈ یونین)
اشیا بہت کم تبدیل ہوا کرتی ہیں، لوگ اُسی شے پر قائم رہنا چاہتے ہیں جو ان کے قبضے میں ہو مستقبل کے مذہب کے معنی صرف مذہب کا مستقبل ہیں، اور یہ ایک روز بروز کے ارتقا کا معاملہ ہے۔

مس وایولٹ کارڈری :-
چونکہ ہزارہا سال سے مذہب میں خفیف تبدیلیوں کے سوا کوئی تغیر واقع نہیں ہوا، اس لئے مجھے کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ آئندہ کوئی تغیر واقع ہوگا۔

مسٹر ریمنڈ میسے :-
نوع انسان کے اخلاق اور روحانیت پر منظم مذہب کے اقتدار کی کامل ناکامی صاف ثابت کرتی ہے کہ اس کا اظہار جماعت کی بجائے فرد کی روحانی ترقی میں ہونا چاہئے۔ پس سوال یہ ہونا چاہئے کہ مستقبل کے مذاہب کیا ہوں گے اور اس کا کوئی جواب نہیں۔

مسٹر سیویل ٹھوکس :-
یہ ممکن نہیں کہ کوئی مذہب کبھی عالمگیر طور پر قبول کر لیا جائے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ شخصی بقا کا جاہلانہ طور پر قبول کیا ہوا نظریہ آئندہ چند ہی نسلوں کے بعد اپنے آخری پیرو بھی کھو بیٹھے گا، اور تخلیقی ارتقا میں یقین رکھنے والوں کی تعداد بڑھ جائے گی۔

مس کیتھلین بنیٹ :-
یہ مجھے نہایت غیر ممکن معلوم ہوتا ہے کہ کوئی ایک مذہب "مستقبل کا مذہب" قرار پائے گا۔ ممکن یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح زندگی مادی پہلو سے فرد کے لئے کم جدوجہد کا مقام بن گئی ہے، اسی طرح زندگی روحانی پہلو سے زیادہ شخصی حیثیت حاصل کرے گی۔ مجھے شک ہے کہ سیاسی اور معاشرتی حیثیت سے پھر کبھی کوئی مذہب اتنی عظمت اور قوت حاصل کر سکے گا جتنی اسلام اور مسیحیت نے اپنے وقت میں حاصل کی۔

مسٹر اوئن نیرز :-

ماضی کا مذہب! کیونکہ مستقبل ماضی کے عکس کے سوا اور کچھ نہیں۔

مس آرنٹ رابرٹسن:۔

میرا خیال ہے کہ آئندہ مذہب بہت کچھ موجودہ مذہب کی طرح ہوگا۔ اکثریت جو چاہتی ہے کہ تفکر و تدبر اُس کے لئے دوسرے کیا کریں کبھی کسی منظم مذہب کا دامن نہ چھوڑے گی، اور اکثریت ہمیشہ موجود رہے گی نہیم اور معقول لوگ بدستور رہائی نشاک بنے رہیں گے۔ لیکن جس طرح آج کل لوگ وہم پرست ہونے پر معذرت خواہ ہوتے ہیں اسی طرح مذہبی ہونے پر معذرت خواہ ہوا کریں گے، اور آثار ایسے نظر آرہے ہیں کہ طلاق اور تحدید نسل وغیرہ کے معاملہ میں مذہب کو قانون میں زیادہ دیر تک دخل انداز ہونے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔

لیڈی ڈرمنڈ ہے:۔

انسان اور حیوان کے لئے رواداری، انسانیت، رحم اور مہربانی کا مذہب مستقبل کا مذہب ہوگا میرے نزدیک دانستہ طور پر نامہربانی کرنا سب سے بڑھ کر ناقابلِ معافی گناہ ہے بہشت بھی ایک ایسی دنیا کے سوا اور کیا ہوسکتی ہے جہاں مہربانی کی حکومت ہو۔

مسٹر جے جیفرسن فارجیون:۔

اگر دنیا نے ترقی کی تو مستقبل کا مذہب ایک ایسا مذہب ہوگا جس کی بنا انسانیت اخوت اور انسانی ضروریات کے احساس پر ہوگی۔ اگر دنیا نے ترقی نہ کی تو یہ کسی نہ کسی شکل میں اُسی مذہب کا استقرار ہوگا جو نیکوں کے لئے نعائم اور بدوں کے لئے سزا کے اصول پر مبنی ہے ہماری حقیقی جزا اور سزا وہ رنج یا راحت ہوگی جو ہمارے افعال کی وجہ سے ہمیں حاصل ہوگی۔ زندگی کے بعد کیا ہوگا؟ یہ ہمیشہ قیاس کا معاملہ رہے گا۔ اور امید کا۔

مسٹر ایچ ایم ہاروڈ:۔

کیا اس مسئلہ پر کسی کی رائے کچھ وقعت رکھتی ہے؟ مجھے یقین ہے کہ میری رائے کچھ وقعت نہیں رکھتی۔ انسان کو شاید یہ امید کرنے کی اجازت دی جاسکتی ہے کہ مستقبل کا مذہب۔ یا مذاہب ـــــ خواہ کچھ بھی ہوں، لیکن وہ زمانہ ماضی کے مذاہب سے زیادہ قابلِ تسلیم اور کم تباہ کن ہوں گے۔

مس ازبیل جیننز:۔

اوہام پرستی کی کوئی دوسری شکل ـــ جیسا کہ ہمیشہ سے ہوتا چلا آیا ہے۔

مسٹر آیور نوبلو:۔

دوسرے مذاہب کی رواداری، آفتاب پرستی کی آمیزش کے ساتھ۔

منصور احمد

درسِ عبرت

میکشِ صہبائے غفلت کون ؟ ہم — ساکنِ دنیائے ظلمت کون ؟ ہم
جس کو دیکھو، شکوہ سنجِ روزگار — جامعِ افلاس و نکبت کون ؟ ہم
جس کو پوچھو، غافل از انجامِ کار — قانعِ ادبار و ذلت کون ؟ ہم
غفلتوں پر عظمتوں کی آرزو! — قائلِ مافوق عادت کون ؟ ہم
پستیوں میں رفعتوں کی جستجو! — منکرِ قانونِ قدرت کون ؟ ہم
آنکھ ہے اور منظرِ عبرت فزا — سوگوارِ نعشِ عزت کون ؟ ہم
کان ہیں اور طعنۂ ماؤشما — نوحہ خوانِ شرم و غیرت کون ؟ ہم
کیا غرض، کیوں بخت کو الزام دیں — اپنے مٹ جانے کی علت کون ؟ ہم
کیا ضرورت، کیوں کسی کا نام لیں — اپنی بربادی کی غایت کون ؟ ہم

لیکن اس پر بھی ہمیں سو ناز ہیں — مخبرِ صادق کی اُمت کون ؟ ہم
مٹ کے بھی ممتاز سے ممتاز ہیں — رحمتِ باری کی آیت کون ؟ ہم
ہم نے کفر و شرک کا گھر ڈھا دیا! — خانہ برانداز کثرت کون ؟ ہم
ہم نے آنکھوں سے خدا دکھلا دیا — کاشفِ اسرارِ وحدت کون ؟ ہم
ہم نے دنیا میں اُجالا کر دیا — شمع افروزِ ہدایت کون ؟ ہم
ہم نے حق کا بول بالا کر دیا — خرمن اندوزِ سعادت کون ؟ ہم
ہستیٔ عرفاں ہمارے دم سے ہے — محرمِ رازِ حقیقت کون ؟ ہم
عالمِ امکاں ہمارے دم سے ہے — حاملِ بارِ امانت کون ؟ ہم

حال کی تہذیب تو پیدا نہیں — دافعِ اسباب وحشت کون ؟ ہم

ہم اگر دعوے کریں، بے جا نہیں
ماحیٔ آثارِ ظلمت کون ؟ ہم
علم کو ترویج کامل ہم نے دی
قاطع بیخ جہالت کون ؟ ہم
ہستیٔ اوہام باطل ہم نے کی
قابضِ روحِ کہانت کون ؟ ہم
ہم نے ہر خطے کو یوناں کر دیا
باعثِ تدوینِ حکمت کون ؟ ہم
ہم نے ہر گوشہ گلستاں کر دیا
موجبِ تعمیمِ صنعت کون ؟ ہم
ہم نے ہفت اقلیم سے جزیے لئے
جالیٔ شمشیرِ ملت کون ؟ ہم
ہم نے دنیا کو نگیں جھنکوا دئے
فاتحِ ابوابِ عظمت کون ؟ ہم
شانِ پامردی سوا ہم سے ہوئی
چہرہ آرائے جلادت کون ؟ ہم
ملک داری کو جلا ہم سے ہوئی
طرح اندازِ سیاست کون ؟ ہم

آؤ، مل کر ہمتوں سے کام لیں
وارثانِ اہلِ ہمت کون ؟ ہم
آؤ، بڑھ کر عزتیں حاصل کریں
مستحقِ گوئے عزت کون ؟ ہم
ہم کو پچھلا بیٹھنا زیبا نہیں
ضامنِ اصلاحِ خلقت کون ؟ ہم
ہم کو بخلِ ناروا پھبتا نہیں
ابرِ پر بارانِ رحمت کون ؟ ہم
منظرِ عبرت فزا ہے یا نہیں
پائے بندِ دامِ عسرت کون ؟ ہم
ماجرا ئے جانگزا ہے یا نہیں ؟
بستۂ زنجیرِ نکبت کون ؟ ہم
یا تو اٹھ کر چارۂ ذلت کرو
حیف ہے پامالِ ذلت کون ؟ ہم
ورنہ مٹنے کے لئے تیار ہو
عادیٔ اتمامِ حجت کون ؟ ہم

حضرتِ آزاد جائے شکر ہے
خادمِ ناچیزِ ملت کون ؟ ہم

آزاد انصاری

شاہنشاہ ہمایوںؒ کے مقبرے میں

اے شاہنشاہ!

تیری کشش مجھے یہاں کھینچ لائی ہے۔ کیا کشش؟ یہ کہ تو اچھا بیٹا تھا۔

اے شاہنشاہ!

دلّی کے مغل کہ لنڈن کے مغل، سلطنتیں لٹانے والے کہ سلطنتیں بنانے والے مغل، ساری دنیا کے آنے والے جانے والے مغل اُس چیز سے جو تجھے حاصل ہوئی بے نصیب رہے یعنی یہ کہ ظہیرالدین نے نصیرالدین کی بیماری لے لی اپنی جان دے دی۔ تو بیٹا تھا بھی اس قابل کہ دنیا کے ناموروں میں سے بالاترین نامور بابر نے تیری خاطر بادشاہی کو ٹھکرا دیا۔ بادشاہی چھوڑ کر ایک غمزدہ باپ بن گیا۔

کس قدر وہ بڑا تھا۔ کس قدر تو پیارا تھا۔

اے شاہنشاہ! غمزدہ باپ تین دفعہ بیٹے کی چارپائی کے گرد پھرتا ہے۔ لوگوں کو طوافِ کعبہ سے کچھ نہیں ملتا۔ بابر کی اولاد کو تیری چارپائی کے تصدق ہندسا ملک کھلونا مل گیا۔

اے نصیرالدین! ظہیرالدین باپ نے دعا پہلے نہیں مانگی۔ جان کی ضرورت تھی دعا کا وقت نہ تھا اس نے جان پہلے رکھ دی۔ موت سے تجھے مول لے لیا۔ ظہیرالدین کو سستا سودا خریدنے کی عادت نہ تھی۔

اے نصیرالدین!

تیرے دم سے زندگی نفع میں رہی موت کو گھاٹا نہ ہوا۔ باپ بیٹے کی یہ بات چارسو سال سے نہ چار ہزار سال سے پرانی نہ ہوگی، بے لطف نہ ہوگی۔

اے نصیرالدین! ایک تنہائی کا مارا غریب الوطن تیری یاد میں اپنی دنیا سے چارسو سال پیچھے ہٹ گیا ہے۔ آ، اُس غریب سے مل۔ تو جو مرتے مرتے بچا اور ڈوبتے ڈوبتے نظام کو بادشاہی دے گیا، تو جسے جنگل میں اکبر جیسا بیٹا ملا، تو جسے پردیس میں فوج ملی اور دیس میں یہ مقبرہ، تو کس قدر پیارا تھا۔ اب کہ تجھے نہ دنیا کے دھندے ہیں نہ سلطنت کے جنجال، تو چارسو سال آگے کو قدم بڑھا، آ اور ایک غریب کی رفاقت کر۔

اے نصیرالدین! میں قبر پرست نہیں ہوں۔ خدا پرست ہوتا۔ تو شاید قبروں کو بھی پوج لیتا۔ تیری

قبر پر زائر بن کر نہیں آیا شاعر بن کر نہیں آیا۔ زائر ہوتا تو یہاں سے قریب ایک اولیا کی درگاہ ہے وہاں کچھ مانگتا مگر میں تو وہاں جاکر بھی تیرے پوتے کی پوتی جہاں آرا کی قبر کو تکا کرتا ہوں۔ وہ اپنے باپ کی خدمت گزار تھی۔ تجھ سے جہاں آرا تک دلی آگرے کی زندگی میں شانِ سعادت تھی۔ پھر وہ ہوا جس نے باپ کو قید . . . .

اے نصیر الدین! معاف کردے یہ ذکر مجھے نہ لانا تھا۔ تو اچھا بیٹا تھا اور مجھے اچھا بیٹا بننے کی امنگ ہے۔ سن! اس گئے گذرے زمانے میں بھی ہندوستان کے مسلمانوں کے پاس سب کچھ ہے۔ نہیں ہے تو اچھا بیٹا نہیں ہے۔

اے نصیر الدین! تیرے مقبرے پر تفریح کے لئے نہیں آیا۔ چاندنی رات خوشگوار موسم کے لئے نہیں آیا۔ پھول نہیں لایا۔ آندھی ہے چبھنے والی دھوپ ہے مگر میرے لئے دل کو ساری دنیا کے خیالوں سے خالی کرکے وہ خلوص لایا ہوں جو ظہیر الدین کے دل میں بہت تھا۔ باپ کی خاطر تو بسترِ مرگ سے اُٹھ بیٹھا تھا۔ باپ کی اسی محبت کی یاد میں میرے دل میں سما جا۔

اے نصیر الدین!

وقت آتا رہتا ہے جاتا رہتا ہے دل نہیں بدلتے، جو دل کہ دل ہیں آ اور زمانے کی قید سے آزاد ہو۔ کیا تیری ماں کبھی تجھے کلیجے سے لگا کر "نصیر" کہہ کر بھینچ لیتی تھی؟ کیا وہ اتنی بڑی تھی کہ ماں بننے کو ملکہ بننے پر ترجیح دیتی تھی؟ کہتی رہتی ہوگی "نصیر! میرے نصیر!!"

کہتی رہتی ہوگی۔

"میرے نصیر! تیرا خدا ناصر"

آسمان کے تارے یوں بنتے ہیں۔

خدا بچہ عطا کرتا ہے۔

ماں دعا دیتی ہے

باپ جان دیتا ہے

. . . .

نصیر! خدا حافظ۔

فلک پیما

راحت کدہ

اس نظم میں حضرتِ اثر صہبائی نے اپنی جواں مرگ رفیقۂ حیات سے عالمِ تصور میں باتیں کی ہیں۔

مینائے دل میں رقصاں صہبائے آرزو ہے
وہ جانِ رنگ و مستی پھر میرے روبرو ہے

چھایا ہوا ہے دل پر رنگِ بہار گویا
ہر راگ نغمہ زا ہے ہر سانس مشکبو ہے

وہ مدھ بھری نگاہیں مستی لٹا رہی ہیں
پھر دل کے میکدے میں اک شورِ ہائے وہو ہے

بدمست ہو رہا ہے گلشن کا ذرّہ ذرّہ
ہر شاخ ایک ساقی ہر پھول اک سبو ہے

رنگینیاں تمہارے جلووں کی گلفشاں ہیں
بے خود ہے بزمِ ہستی سرشارِ رنگ و بو ہے

ہر ساز میں تمہارے نغمے بسے ہوئے ہیں
ہر پھول میں تمہاری تصویر ہو بہو ہے

اک نور کا تلاطم اک گلشنِ تبسم
میرے حریمِ دل میں یہ کون خوبرو ہے

دیر و حرم کے جھگڑے ہر سو چھڑے ہوئے ہیں
لیکن مرے لبوں پر تیری ہی گفتگو ہے

جانے کہاں ہیں؟ کیا ہیں؟ حور و بہشت و کوثر
میرے لئے تو سب کچھ اے جان تو ہی تو ہے

دنیا سے گوشہ گیری عقبیٰ سے بے نیازی
"راحت" ترے گدا کی یہ بھی عجیب خو ہے

اصلاحِ ادب

(۳)

بہ سلسلۂ اشاعت مئی

نثر

فقرہ۔ مشاعرے میں مجھے سوائے آپ کے کسی کی غزل پسند نہیں آئی۔

اصلاح۔ مشاعرے میں مجھے آپ کے سوا کسی کی غزل پسند نہیں آئی۔

وجہ۔ "سوائے" جب صحیح ہو سکتا ہے کہ اس کے آگے فارسی یا عربی کا کوئی لفظ آئے اس صورت میں "کے" نہیں لکھا جائے گا۔ مثلاً سوائے دل۔

فقرہ۔ وہ بیچارہ دائم المریض ہے

اصلاح۔ وہ بیچارہ دائم المرض ہے۔

وجہ۔ "دائم المریض" قواعد کی رُو سے غلط ہے۔

فقرہ۔ دہلی قدیم الایام سے ہندوستان کا پایۂ تخت چلی آتی تھی۔

اصلاح۔ دہلی قدیم زمانے سے ہندوستان کا پایۂ تخت چلی آتی ہے۔

وجہ: "قدیم الایام" قواعد کے لحاظ سے صحیح نہیں

فقرہ۔ سر سیّد احمد خاںؒ علی گڑھ کالج کی روحِ رواں تھے۔

اصلاح۔ سر سیّد احمد خاںؒ علی گڑھ کالج کی روح و رواں تھے۔

وجہ۔ روحِ رواں بے معنی ترکیب ہے

فقرہ۔ اگرچہ سلیمہ خود بھی غضب کی لڑاکی ہے لیکن نعیمہ کی شرارتیں دیکھ کر وہ بھی ہکّی بکّی رہ گئی۔

اصلاح۔ اگرچہ سلیمہ خود بھی غضب کی لڑاکا ہے۔ لیکن نعیمہ کی شرارتیں دیکھ کر وہ بھی ہکّا بکّا رہ گئی

وجہ۔ "لڑاکا" اور "ہکّا بکّا" مذکر و مونث دونوں کے لئے یکساں آتے ہیں۔

فقرہ۔ ترقی اور تنزلی خدا کے ہاتھ ہیں۔

اصلاح۔ ترقی اور تنزّل خدا کے ہاتھ ہے

وجہ (۱) "تنزلی" کوئی لفظ نہیں۔ تنزُّل بروزنِ تفعُّل صحیح ہے۔

(۲) بے جان چیزوں کے لئے فعلِ واحد

لانا فصیح ہے۔

فقرہ۔ انسپکٹر صاحب نے مجھ سے دو سوال پوچھے میں نے دونوں کا صحیح صحیح جواب دے دیا۔

اصلاح۔ انسپکٹر صاحب نے مجھ سے دو سوال کئے میں نے دونوں کا صحیح صحیح جواب دے دیا۔

وجہ۔ "سوال پوچھنا" نہیں بلکہ "سوال کرنا" صحیح و فصیح ہے

فقرہ۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں باہمی منافرت نہ پھیلاؤ۔

اصلاح۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں منافرت نہ پھیلاؤ۔

وجہ۔ "منافرت" (باب مفاعلہ) میں خود "باہمی" کے معنی موجود ہیں۔

فقرہ۔ ہر چمکدار چیز سونا نہیں ہوتی۔

اصلاح۔ ہر چمکیلی چیز سونا نہیں ہوتی۔

وجہ۔ "چمک" ہندی اور "دار" فارسی ہے۔ لہذا ترکیب درست نہیں۔ اسی طرح "سمجھ دار" "لچکدار" وغیرہ بھی غلط ہیں۔

فقرہ۔ اُسے سرھانے کے بغیر نیند نہیں آتی

اصلاح۔ اسے تکیے کے بغیر نیند نہیں آتی۔

وجہ۔ "سرھانا" "پائنتی" کی ضد ہے نہ "تکیے" کا محل ہے۔

فقرہ۔ کیا آپ شادی شدہ ہیں؟

اصلاح۔ کیا آپ بیاہے ہوئے ہیں؟

یا

کیا آپ کی شادی ہو چکی ہے۔

وجہ۔ "شادی" بیاہ کے معنی میں فارسی میں مستعمل نہیں۔ اس لئے "شادی شدہ" کی ترکیب غلط ہے۔

فقرہ۔ جلسے میں بے شمار مسلمان۔ اہل ہنود اور سکھ شریک ہوئے۔

اصلاح۔ جلسے میں بے شمار مسلمان ہندو اور سکھ شریک ہوئے

وجہ۔ "اہلِ ہنود" کی ترکیب غلط ہے۔

فقرہ۔ یہ کتاب طلبا اور عام شائقینِ اردو کے لئے یکساں مفید و دلچسپ ہے۔

اصلاح۔ یہ کتاب طَلَبہ اور عام شائقینِ اردو کیلئے یکساں مفید و دلچسپ ہے۔

وجہ۔ طالب کی جمع "طَلَبہ" صحیح اور "طُلبا" غلط ہے

فقرہ۔ آج کل بیسوں ایم اے اور سینکڑوں بی اے مارے مارے پھر رہے ہیں۔

اصلاح۔ آج کل بیسیوں ایم اے اور سینکڑوں بی اے مارے مارے پھر رہے ہیں

وجہ۔ یہ "بیسوں" کا نہیں بلکہ "بیسیوں" کا محل ہے۔ "بیسوں" یوں استعمال کرتے ہیں "امتحان کے لئے نصاب کی بیس کتابیں مقرر تھیں۔ میں نے بیسوں (بیس کی بیس) ہی اچھی طرح دیکھ ڈالیں۔

فقرہ۔ افسوس ہے کہ بمبئی کے ہندو مسلمانوں میں فساد ہوگیا۔

اصلاح۔ افسوس ہے کہ بمبئی کے ہندوؤں اور مسلمانوں میں فساد ہوگیا۔
وجہ۔ "ہندو مسلمانوں" سے یہ معنی بھی پیدا ہوتے ہیں۔ کہ وہ مسلمان جو ہندو ہیں۔
فقرہ۔ لاہور اردو کا ٹکسال بن گیا۔
اصلاح۔ لاہور اردو کی ٹکسال بن گیا۔
وجہ۔ "ٹکسال" مؤنث ہے اور حرفِ اضافت اسی کے مطابق آئے گا نہ کہ لاہور کے۔
فقرہ۔ تم خود اپنی کرتوتوں سے تباہ ہوئے
اصلاح۔ تم خود اپنے کرتوت سے تباہ ہوئے۔
وجہ۔ "کرتوت" لفظاً و معناً دونوں طرح مذکر اور جمع ہے۔
فقرہ۔ ہم سب کو قوم و ملک کی خدمت اور فلاح و بہبودی میں حصہ لینا چاہئے۔
اصلاح۔ ہم سب کو قوم و ملک کی خدمت اور فلاح و بہبود میں حصہ لینا چاہئے۔
وجہ۔ بہبودی غلط اور "بہبود" صحیح ہے۔
فقرہ۔ وہ افسر بہت راشی ہے۔
اصلاح۔ وہ افسر بہت رشوت خوار ہے۔
وجہ۔ "راشی" کے معنی ہیں رشوت دینے والا ایسے موقع پر رشوت خوار۔ رشوت ستاں یا مُرتشی لکھنا چاہئے۔
فقرہ۔ تمہاری یہ لاپرواہی کسی دن رنگ لاکر رہے گی۔

اصلاح۔ تمہاری یہ بے پروائی کسی دن رنگ لاکر رہے گی۔
وجہ۔ "پرواہ" غلط اور "پروا" صحیح ہے۔ چونکہ "پروا" فارسی ہے۔ اس لئے "بے پروائی" ہی درست و فصیح ہے۔

نظم

شعر۔ تجھے تو وعدۂ دیدار ہم سے کرنا تھا
یہ کیا کیا جو جہاں کو امیدوار کیا
اصلاح تجھے تو وعدۂ دیدار ہم سے کرنا تھا
یہ کیا کیا کہ جہاں کو امیدوار کیا
وجہ۔ "جو جہاں" میں تنافر ہے۔
شعر اجل سے بڑھ کے محافظ نہیں کوئی اپنا
خدا کی شان کہ دشمن نگاہبان نکلا
اصلاح اجل سے بڑھ کے محافظ کوئی نہیں اپنا
خدا کی شان کہ دشمن نگاہبان نکلا
وجہ۔ "نہیں کوئی" سے "کوئی نہیں" بہتر ہے اس سے "کوئی" پر زور آگیا۔ جو شاعر کا اصل مقصد ہے
شعر کعبہ نیا بناؤ مرے دل کو توڑ کر
اے مہرباں اب آپ کے قابل یہ گھر نہیں
اصلاح کعبہ نیا بنایئے اِس دل کو توڑ کر
اے مہرباں! اب آپ کے قابل یہ گھر نہیں
وجہ۔ "بناؤ" اور "آپ" میں شتر گربہ ہے۔
مصرع۔ پندرہ روزہ یہ رسالہ ہے۔
اصلاح۔ پانزدہ روزہ یہ رسالہ ہے۔
وجہ۔ "پندرہ" ہندی اور "روزہ" فارسی ہے

لہذا ترکیب درست نہیں۔

شعر تم سراسر رنج دینے پر جب آمادہ ہوئے
میں سراپا درد سہنے کے لئے دل ہوگیا

اصلاح تم سراسر رنج دینے پر جو آمادہ ہوئے
میں سراپا درد سہنے کے لئے دل ہوگیا

وجہ۔ "جب" سے "جو" بہتر ہے۔ اس سے "آمادہ" کا ایک الف گرنے کی خامی بھی رفع ہوگئی۔

شعر کہیں رسوا نہ ہوں رنگینیاں دردِ محبت کی
میرا اتنا خیال اے دیدۂ خونبار کر لینا

اصلاح کہیں رسوا نہ ہوں رنگینیاں دردِ محبت کی
ذرا اتنا خیال اے دیدۂ خونبار کر لینا

وجہ۔ دوسرے مصرع میں "مرا" حشو ہے اور "مرا اتنا" سے ذم کا پہلو پیدا ہوتا ہے۔

شعر۔ سر نہیں اٹھتا ہے.... پائے ساقی سے کبھی
پھر بھی ہیں نا قابلِ یک سجدۂ مے خانہ ہم

اصلاح سر جھکا رہتا ہے..... پائے ساقی پر مدام
پھر بھی ہیں نا قابلِ یک سجدۂ مے خانہ ہم

وجہ۔ "نہیں اٹھتا ہے" میں "ہے" حشو ہے۔ "نہیں" میں تو خود "ہے" کا جزو شامل ہے۔ اس لئے اس کے بعد "ہے" نہیں لکھنا چاہئے۔ اور پھر شعر میں جہاں الفاظ ناپ تول کر رکھنے پڑتے ہیں "مدام" کا لفظ نہایت بے تکلفی سے آگیا ہے جس نے شعر کو بے کیف کر دینے کی بجائے بادۂ شعریت سے لبریز کر دیا۔

شعر۔ پھر کسی کی انتظاری نے بنایا بُت مجھے
پھر بہ رنگِ چشمِ روزنِ چشم کا حلقہ ہُوا۔

غلطی۔ "انتظاری" صحیح نہیں۔ انتظار باندھنا چاہئے۔

شعر۔ دیکھ بزمِ رنگ و بو کو غور کی آنکھوں سے دیکھ
کیا عیاں ہوتا ہے ان بھکے ہوئے جلووں میں دیکھ

غلطی۔ "آنکھوں" اور "جلووں" میں ایطاء جلی ہے لہذا قافیے غلط ہیں

شعر:۔
میں وہ اک سوختہ دل ہوں کہ میری آہ سوزاں سے
بھڑک اٹھتی ہے آتش سارے جنگل کے چناروں میں

غلطی۔ (۱) "آگ" کی جگہ "آتش" بغیر ترکیب فارسی کے بغیر شعر میں باندھنا صرف خلاف محاورہ ہی نہیں بلکہ غلط ہے۔

(۲) پہلے مصرع میں "اک" اور دوسرے میں "سارے" حشو ہے۔

مصرع۔ شادیانے طیور گاتے ہیں۔

غلطی۔ شادیانے گائے نہیں بلکہ بجائے جاتے ہیں۔

شعر۔ ہر برس ہو خوشی سے سالگرہ
یونہی جیسے رہیں سدا یعنی

غلطی (۱) اس نظم کے تمام قافیوں کے اخیر میں "انی" کا جزو شامل ہے۔ یعنی "ثانی" اور "ربانی" وغیرہ قوافی لکھے گئے ہیں۔ لہذا "یعنی" کا قافیہ غلط ہے

شعر۔ منزلِ الفت میں تو اک رہنمائے دہر ہے
عشق کی ملت کا تو بے شک امامِ عصر ہے

غلطی (۱) "دہر" اور "عصر" کا قافیہ غلط ہے

(۲) پہلے مصرع میں "اک" اور دوسرے میں "تو"

حشو ہے۔ "بے شک" کی بھی چنداں ضرورت نہیں۔

شعر:۔

زندگی اک باغ ہے اس باغ کا مالی ہوں میں

زندگی ہے اک خزانہ جس کا رکھوالی ہوں میں

غلطی:۔ "رکھوالی" "رکھوالا" (محافظ) کے معنی

میں غلط ہے۔

شعر:۔

قسم ہے جھومتا رہتا ہوں میں جوش مسرت سے

مرے ساغر میں جب تک بادۂ انگور رہتی ہے

غلطی (۱) پہلے مصرع میں "میں" حشو ہے۔

(۲) بادہ مذکر ہے۔

شعر:۔ نیّرِ برجِ شرف مہر سپہر انور

جلوۂ صبح ازل شعشۂ حسنِ معیار

غلطی (۱) "شعشۂ" کی جگہ "شعشہ" لکھنا صحیح نہیں۔

(۲) شعشۂ حسنِ معیار کی ترکیب بے معنی ہے۔

شعر:۔

گو گلستانِ جہاں پر میری نظریں کم پڑیں

اور پڑیں بھی تو خدا شاہد بچشم نم پڑیں

خامی (۱) "گو گلستان" کی ترکیب میں ثقالت

اور تنافر ہے

(۲) "اور" کو "اُر" باندھنا خلافِ فصاحت ہے

(۳) "چشم نم" بالاتفاق متروک ہے۔ اس کی

جگہ "چشم پُرنم" لکھنا چاہئے۔

شعر:۔

وہی سر ہے کہ اب سنگِ حوادث کا نشانہ ہے۔

یہی سر تھا کہ جس پر سایۂ دیوارِ جاناں تھا۔

خامی:۔

دوسرے مصرع میں "کہ" حشو ہے۔

نشتر جالندھری

بڑے آدمیوں کی بُری حالت

ہمدردی کی صرف انہیں کو ضرورت نہیں جو دنیا میں ناکام وگمنام ہیں بلکہ انہیں بھی اس کی حاجت ہے جو شہرت وکامرانی کی چوٹیوں پر پہنچ چکے ہیں۔ کہتے ہیں کہ مسولینی دُنیا کا سب سے زیادہ تنہا آدمی ہے ہوور (صدر جمہوریہ امریکہ) سب سے زیادہ پریشان آدمی سٹیلن (روسی حکمران) سب سے زیادہ خوف زدہ آدمی، ریمزے میکڈانلڈ سب سے زیادہ خستہ دماغ آدمی۔ کمال پاشا سب سے زیادہ بے خواب آدمی۔ گاندھی سب سے زیادہ حیران آدمی اور موسیو بریاں سیاست دانوں میں سب سے زیادہ ناخوش آدمی ہے۔

گلچیں

ہوں آرزوؤں کا ایک تابوت زندگی کا مزار ہوں میں
جنازہ بردار آپ اپنا ہوں آپ ہی سوگوار ہوں میں

نہ کیوں نہالِ امید کے سینچنے کو خوننابہ بار ہوں میں
جو بجلیوں سے ہُوا ہے شاداب اُس چمن کی بہار ہوں میں

یہ انقلاب زمانہ میری تڑپ کا اک زندہ معجزہ ہے
قرار جس کے لئے پیامِ اجل ہے وہ بیقرار ہوں میں

بلا کی آغوش میں پلا ہوں۔ ہے شامِ غم صبحِ عید مجھ کو
گہر بکف ہوں اگرچہ موج و نہنگ سے ہمکنار ہوں میں

مرے خرابات کی جو منظور سیر ہے۔ ظرف لا کہیں سی
کہ خونِ دل پی رہا ہوں امرت سمجھ کے وہ میگسار ہوں میں

سنائی دیتے ہیں جس کی ہر لہر سے انا البحر کے ترانے
ہیں کوثر و سلسبیل بھی جس کے تشنہ وہ جوئبار ہوں میں

جو دیکھنا ہو کہ عشق میں دل پہ کیا گزرتی ہے۔ مجھ کو دیکھو
زمانہ بھر کے بلاکشوں کی مٹی ہوئی یادگار ہوں میں

نئے مضامیں کے پھول نشتر ورق ورق پر مہک رہے ہیں
بہارِ معنی ہے میرا دیواں وہ شاعرِ تازہ کار ہوں میں

نشتر جالندھری

حسین بن منصور حلّاج

کس قدر حیرت کا مقام ہے کہ حسین بن منصور الحلاج جو عوام میں نہیں بلکہ خواص میں بھی اپنے باپ منصور حلّاج کے نام سے مشہور ہیں اور جن کے نعرۂ انا الحق کی صدائے بازگشت شعریت کے سر بفلک ٹیلوں اور تصوف وسلوک کے آسمان بوس میناروں سے ٹکراتی ہوئی آتی ہے۔ آج اکثر لوگ تاریخی حیثیت سے اُن کے حالات سے بے خبر ہیں۔ میں نے اکثر مدعیانِ تصوف سے حسین کے متعلق دریافت کیا لیکن بجز چند مشہورِ عوام قصوں اور اور مستبعد واقعات کے کوئی ایسی چیز جو ان کی سیرت اور سوانح حیات پر روشنی ڈال سکے نہیں مل سکی۔ میں ان واقعات کے ابطال کی خدانخواستہ یہاں جرأت نہیں کرسکتا کہ آہنیں سلاخوں اور وزنی بیڑیوں کو حسین نے ایک اشارے میں توڑ کر رکھ دیا اور قتل کے بعد اُن کے خون کے ہر قطرہ نے "انا الحق" کی صدائیں بلند کیں، بلکہ میں حسین کو بہ حیثیت ایک انسان کے منظرِ عام پر لانا چاہتا ہوں۔ افسوس ہے کہ تفحص و تحقیق کے بعد بھی حسین کی حیات کے اکثر پہلو تاریکی میں رہے۔ تاہم جو مختصر واقعات درج ذیل ہیں ان میں سے ایک خاکا کم از کم انسانی تخیل مرتب کرسکتا ہے۔

سب سے بڑی غلط فہمی حسین کے متعلق یہ پھیلی ہوئی ہے کہ لوگ ان کو منصور حلّاج کے نام سے پکارتے ہیں حالانکہ ان کا صحیح نام حسین تھا اور منصور حلّاج اُن کے باپ کا نام تھا۔ اُس کے متعلق کوئی صحیح قیاس قائم نہیں کیا جاسکتا کہ حسین کے نام کو دنیا نے اُن کے پدرِ بزرگوار کے نام میں اس شدت سے ضم کیوں کردیا کہ آج دُنیا حسین کو منصور کہہ کر پکارتی ہے۔ میرا مطلب اس تشریح سے یہ نہیں ہے کہ دنیا اس اجتہادی غلطی کو یک لخت ترک کردے بلکہ مقصد یہ ہے کہ منصور حلاج کا نام لیتے ہوئے ذہن و دماغ میں یہ چیز ضرور محفوظ رہے کہ ہم حسین کو اس نام سے مخاطب کر رہے ہیں۔

دوسری شدید غلط فہمی نے حسین کے متعلق اس عام خیال کو ایک حقیقت کی شکل میں دنیا کے سامنے پیش کر کے یہ زبردست مغالطہ پیدا کیا ہے کہ دنیا ان کو ایک زاہدِ خشک تصور کرتی ہے جن کو دنیوی حالات و معاملات سے کبھی دلچسپی نہیں رہی گویا ان کی منزل تقشف کی سرحد دنیائے رہبانیت سے جا ملی تھی۔ ان غلط فہمیوں کا ازالہ ذیل کے واقعات سے اچھی طرح ہوسکتا ہے۔

حسین شیراز کے قریب مقام بیضا میں ۱۵ رجب ۲۶۲ھ کو پیدا ہوئے۔ ان کے باپ بہت بڑے عالم و فاضل تھے وہ ابتدا میں حلاّجی کرتے تھے۔ اس کے بعد انہوں نے بزّازی کا کام شروع کر دیا تھا حسین نے مقام واسط میں تربیت پائی۔ چونکہ فطرتاً ذہین اور طباع تھے۔ لہذا تھوڑے ہی دنوں میں غیر معمولی علمی قابلیت پیدا کر لی۔ نصاب کے طور پر حسین نے فلسفہ۔ منطق۔ معقول و منقول سب ہی کچھ پڑھا۔ لیکن تصوف سے ان کو ایک ایک خاص لگاؤ اور گہرا تعلق تھا۔

اسی وجہ سے ایام طالب علمی ہی میں ان پر ایک استغراقی کیفیت طاری رہتی تھی۔ تعلیم ختم کرنے کے بعد یہ رنگ اتنا تیز ہو گیا کہ ان کے دل و دماغ نہیں بلکہ روح پر مکمل بے خودی مستولی ہو گئی۔ تھوڑے عرصہ کے بعد ہوش آیا تو صاحب طریقت کی تلاش شروع کی۔ چنانچہ اسی درد کے علاج کی خاطر متعدد مقامات میں سرگرداں پھرتے رہے۔ آخر کار تستر میں پہنچ کر حضرت خواجہ عبد اللہ تستری سے جو اس عہد کے ایک مشہور باخدا بزرگ تھے شرف بیعت حاصل کیا۔ حضرت خواجہ تستری قدس سرہٗ کی نظر کیمیا اثر نے اس سونے کو کندن بنا دیا۔ وہاں سے بغداد شریف میں آکر حضرت خواجہ سری سقطی۔ خواجہ جنید بغدادی۔ ابو بکر شبلی وغیرہ قدس اللہ اسرارہم جیسے اکابر ملت اور شیوخ روزگار کے حلقۂ صحبت میں رہ کر استفادہ کیا۔ اس کے بعد خواجہ یعقوب کی صاحبزادی سے حسین نے نکاح کیا جن سے دو فرزند تولد ہوئے۔ حسین نے اگرچہ اپنی زندگی گوشۂ گمنامی میں گزاری تھی اور نام و نمود سے وہ قطعاً احتراز و اجتناب کرتے تھے لیکن جامۂ فانوس شعلہ کو عریاں ہونے سے نہیں روک سکتا۔ اسی طرح ان کے آفتاب کمال کی کرنوں نے وہ جہاں افروز صورت اختیار کر لی کہ عقیدت مند نگاہوں کو اکتساب تجلی کے لئے بے تاب کر دیا چنانچہ حسین کی ذات عوام الناس کی توجہات کا مرکز بن گئی۔

حسین چونکہ ابتدائے شباب سے ایک مست صوفی تھے لہذا ان کے "شطحیات" نے عقیدت مندوں کے دلوں میں عظمت و ہر دلعزیزی کے دریا موجزن کر دیئے۔ یہاں تک کہ خلیفہ مقتدر باللہ بھی حسین کے ارادت کیشوں میں داخل ہو گیا۔ خلیفہ کا رجحان طبع حامد بن عباس کو جو ایک چالاک وزیر تھا ناگوار گزرا اور حسین کی تنقیص کے لئے وہ موقع تلاش کرنے لگا۔ سوئے اتفاق سے وہ جلد اپنے ارادہ میں کامیاب ہو گیا۔ حامد بن عباس کی مجلس گرم تھی۔ اس میں علاوہ دیگر اعیان سلطنت کے حسین بھی موجود تھے مختلف موضوعات پر مباحث ہو رہے تھے۔ کسی شخص کے استفسار پر حسین نے یہ کہہ دیا کہ اگر کسی پر حج واجب ہو اور وہ جا نہ سکے تو چاہئے کہ اپنے گھر کو پاک کرے اور ایام حج میں یتیموں کو کھانا کھلائے اور ان کی خدمت کرے۔ ابی بکر نے جو قاضئ بغداد تھے یہ سن کر حسین سے دریافت کیا کہ کس کتاب میں انہوں نے یہ مسئلہ دیکھا ہے۔ حسین نے جواب دیا کہ حسن بصری کی کتاب اخلاص میں۔ اس پر قاضی صاحب نے برہم ہو کر کہا کہ او کشتنی! میں نے وہ کتاب دیکھی ہے۔ اس میں یہ مسئلہ

نہیں ہے۔ قاضی ابی بکر نے لفظ کشتنی غصہ کی حالت میں کہہ دیا تھا۔ لیکن وامد بن عباس کو ایک بہانہ ہاتھ آگیا۔ اور اس نے اپنے جذبۂ عداوت کے تحت کہا کہ قاضی کے منہ سے جو حکم نکلا ہے جاری ہونا چاہئے۔ قاضی صاحب معذرت کرنا چاہتے تھے لیکن حامد بن عباس کی خشم آلود نگاہوں نے ان کے لبوں پر مہر سکوت لگادی اور وہ اظہار حق نہ کرسکے۔ چنانچہ قاضی کے حکم کے مطابق فتویٰ لکھ کر مقتدر باللہ کے روبرو پیش کیا گیا۔ خلیفہ کا دل اگرچہ حسین کی عقیدت سے لبریز تھا لیکن احترام شریعت کی وجہ سے وہ اختلاف نہ کرسکا اور دارالامارۃ میں صدرالدین محتسب نے حسین کے تازیانے لگائے لیکن یہ جاری شدہ حد بھی حسین کی زندگی کا خاتمہ نہ کرسکی۔ اور وہ زنداں میں ڈال دئے گئے۔ زندان کی تکالیف مجرموں کے لئے البتہ باعث سوہان روح ہوتی ہیں لیکن ایسے شخص کے لئے جس کو معرفت الٰہی حاصل ہوگئی ہو ہرگز باعث اذیت نہیں ہوسکتیں۔ چنانچہ حسین کا استغراق اور وجد آفریں مستی اور زیادہ بڑھ گئی اور ان کی زبان سے ایسے کلمات جاری ہوگئے جن کو جب حامد بن عباس نے اپنے مقصد کی تکمیل کے لئے اہل شریعت کے سامنے پیش کیا تو ان پر کفر کا فتویٰ لگا دیا گیا۔ موثق طور پر اس کی تصدیق نہیں ہوسکتی کہ حسین نے "انا الحق" ہی کہا۔ بہرحال انہوں نے جو کچھ بھی کہا حامد بن عباس کی سیاست نے ان کے الفاظ کو ایسا جامہ پہنا کر علما کے روبرو پیش کیا کہ ۹ جمادی الثانی سنہ ۳۰۹ھ میں بروز سہ شنبہ حضرت حسین سولی پر لٹکا دئے گئے۔

منصور اور دار و رسن کے متعلق اتنے کثیر التعداد قصے مشہور ہیں کہ ان کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں۔ خاتمۂ مضمون سے قبل صرف ایک پر لطف واقعہ کا ذکر کردینا کافی ہے۔

جب حضرت حسین دار کے قریب لائے گئے تو لوگوں نے ان کو سنگسار کرنا شروع کیا۔ حضرت ابوبکر شبلی قدس سرہٗ نے بھی عوام کی متابعت میں ایک پھول حسین کی طرف پھینک دیا۔ پھول کا لگنا تھا کہ حسین نے ایک دردناک آہ کھینچی۔ لوگوں نے متحیر ہوکر دریافت کیا کہ پتھروں کی تکلیف کے مقابلہ میں سکوت اور ایک پھول کی وجہ سے اس قدر اضطراب؟ حسین نے جواب دیا کہ پتھر مارنے والوں سے مجھے شکوہ نہیں ہے۔ کیونکہ ان کی نگاہوں پر بےخبری کے پردے پڑے ہوئے ہیں۔ لیکن شبلی تو حالات سے باخبر ہیں اُن سے مجھے ایسی توقع نہ تھی۔

منظور حسین ماہر القادری

غزل

اظہارِ سوزِ غم پہ ہے قابو، مگر نہیں
مجھ کو پسند جرأتِ شمعِ سحر نہیں

تکلیفِ جلوہ اور ابھی اے جمالِ دوست
شیرازۂ حواس ابھی منتشر نہیں

تاثیر پائی ہے صلۂ ضبطِ درد میں
ورنہ دعائیں اپنی جگہ کچھ اثر نہیں

ہر سعیِ مستقل ہے نتیجہ لئے ہوئے
کوشش میں پختگی ہو تو منزل کدھر نہیں

شانوں پہ زلف محوِ تماشائے آئنہ
"اُن کی نگاہ روزنِ دیوار پر نہیں"

اک روز اُن کے دل کو ہلا دینگے دیکھنا
نالے یہی کہ جن پہ گمانِ اثر نہیں

راقم ہو جس کا شاد وہ خط اُن کے واسطے
کتنا ہی مختصر ہو مگر مختصر نہیں

شاد عارفی

گرمیوں کا زمانہ

۸ بجے صبح

خدا ہے تو اور خدا نہیں ہے تو بھی دُنیا خوب ہے ۔ خوبصورت بستی ، دلچسپ مقام ، کوشش کا بدلہ آرام ، جیسا کرو ویسا بھرو ، بیج بوؤ پودا اگے ، پھول سونگھو ، پھل کھاؤ ، ٹھنڈا میٹھا پانی پیئے جاؤ اور جیئے جاؤ ۔ محنت کرو ، عزت پاؤ ، اپنے ملک کو بڑھاؤ ، دوسرے ملکوں کی سیر کرو اور ہر روز نئے سے نیا تماشا دیکھو ۔ آدمیوں سے ملو ملاؤ ، لوگوں میں ہنسو ہنساؤ ۔ میل جول کی محفلیں تعلیم و ترقی کی انجمنیں ان میں چاند تارا بن کر چمکو ، علوم کی معلومات سے فنون کی حسن آرائیوں سے اپنا دامن مالا مال کرو ۔ بچوں کی ہنسی ، بیوی کی دلداری ، ماں بہنوں کی محبت ، دوستوں کی الفت ہمارے ہر طرف کیسی کیسی خوشبوؤں کے رنگا رنگ پھول کھلے ہوئے ہیں ؎

دنیا بھی اک بہشت ہے اللہ رے کرم   کن نعمتوں کو حکم ملا ہے جواز کا

میں یہ کروں گا ، میں یہ بنوں گا ، میں یوں جیوں گا !

وہی دن

۲ بجے سہ پہر

خواہ خدا ہے خواہ نہیں ہے اس دنیا کا نظام انتظام دونوں ابتر ہیں ۔ کہیں نیکی کا بدلہ بدی کہیں بدی کا نیکی ، کبھی بے کوشش کے عزت و احترام ، کبھی لاکھ سر کو پٹکو مگر نتیجہ صفر یعنی کبھی تو کوشش کا پھل اور مشکلوں کا حل لیکن کبھی محض کورا جواب ، نیک و بد دونوں کے لئے آرام ، اذیتیں ، عشرتیں ، بے چینیاں کوئی تمیز نہیں ، کوئی فرقِ مراتب نہیں ، تلوار چل رہی ہے جو سامنے آگیا اس کا سر قلم ، سیم و زر لٹ رہا ہے کسی نے ہاتھ پاؤں مار کر کسی نے گھر بیٹھ کر جو پالیا سو پالیا ۔ ایک افراتفری ، ایک ہلڑ ، کبھی اس میں ناچ کھیل ، کبھی دھول دھپا ، کبھی شور و غل اور کبھی قبر کی سی خاموشی ۔ حب الوطنی ، قوم پرستی ، خلق پروری عموماً خود غرضی

خودنمائی، خودآرائی کی صورتیں اور بس۔ محبتیں اسفل جذبات کی شکلیں، مصروفیتیں بیزاری سے بچنے کی راہیں۔ محفلیں انجمنیں، باہمی ستائش وخوشامد کے جمگھٹے۔ قدیم دستور جماعتی سازشوں کے نتیجے، جدید تحریکات فقط ذاتی لُطف اندوزی کے طریقے، اور کچھ بھی نہیں۔ بے قاعدہ مصروفیت، بے فائدہ محنت، جھوٹی خالی سی مسرت، ان کا بازار دن رات گرم۔ خوشیوں میں ہر کوئی شریک۔ غم و رنج میں شاذونادر ہی کوئی دوست، بے اعتنائی، سردمہری۔ بے رحمی، زندگی کی راحتیں دوسروں کی کلفتیں بھول جانے سے قائم، دنیا کے لُطف بے مروتی اور بے فکرے پن کے زور سے برقرار ؎

ڈنیا بھی عجب گھر ہے کہ راحت نہیں جس میں　　یہ دوست ہے وہ دوست مروت نہیں جس میں
یہ شہد ہے وہ شہد حلاوت نہیں جس میں　　وغیرہ وغیرہ

برباد ہو جائے یہ دنیا، بھاڑ میں جائے یہ زندگی، کوئی کب تک جئے اور کس لئے اور کیوں؟؟؟

---

۸ بجے دُنیا ایک بہشت، ۲ بجے کائنات ایک جہنّم .... اور یہ سب کچھ صرف اس لئے کہ صبح ۸ بجے میں باغ میں ٹہل رہا تھا، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی، پھولوں کی خوشبو پرندوں کے چہچہوں سے اٹکھیلیاں کر رہی تھی، جسم میں طاقت تھی، دماغ میں تازگی، دل میں جوش۔ اور سہ پہر کو ۲ بجے گرمی نے نڈھال کر دیا تھا، سُستی جسم پر سوار تھی اور نیند نہ آتی تھی کہ کسی کم بخت نوکر نے بستر پر پلنگ پوش کے نیچے ایک موٹا کمبل بچھا رکھا تھا جس نے جسم کو بے چین اور دل و رُوح کو تھوڑی دیر کے لئے قطعاً مضمحل کر دیا!

بشیر احمد

یہ آسان نہیں

کہ ہم اپنی غلطی پر شرمسار ہوں
یا پھر از سرِ نو اپنا کام شروع کر دیں
یا درگذر کر دیں اور بُھلا دیں
یا اپنی طبیعت پر پورا قابو پالیں
یا ایک بلند معیار قائم کئے رکھیں
یا یقین کئے رکھیں کہ ہر تنگی کے بعد آسانی ہے۔
لیکن
ایسے ہی مشکل کاموں میں صحیح زندگی کا جلوہ ہے۔

گلچیں

زبیدہ

اُس دن بہت گرمی تھی۔ یوں تو روز ہی مکان تنور بن جاتا تھا مگر اُس دن دھوپ بہت ہی تیز تھی اور پھر اس بلا کا حبس تھا کہ بدن پر کپڑا نہیں ٹھہرتا تھا۔ شہر میں بجلی کہیں نہ تھی اور پنکھا ہاتھ سے دیر تک جھلا نہیں جاتا تھا۔ سلیم اپنے کمرے میں مُردے کی طرح پڑا تھا۔ دروازے کھُلے تھے کہ شاید اگر ہوا چل پڑے تو کچھ ادھر بھی گذر جائے۔ مگر اس دن معلوم نہیں ہوا کہاں بندھی پڑی تھی۔ کیا مجال جو کوئی پتہ تک ہل جائے۔

سلیم پہلے تو سونے کی کوشش میں پلنگ پر لیٹا رہا کبھی اس کروٹ کبھی اُس کروٹ۔ مگر نیند نے بھی قسم کھا رکھی تھی کہ اور کسی دن آئے تو آئے اس دن تو بالکل نہیں آنے کی۔ اس لئے حسبِ عادت ایک علمی کتاب اٹھا کر پڑھنے لگا۔ ایک صفحہ، دو صفحے سوا دو؛ دو لکیر اور، اور بس لفظ آنکھوں سے مٹنے ہی لگے تھے کہ کھٹ کھٹ کسی آنے والے کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ سلیم چونک پڑا۔ غصہ بھی آیا کہ اس وقت اور پھر اس قدر شور مچا کر آنے سے فائدہ اور یہ ہے کون اور یہ کہ اب تو ضرور وہ اپنی ممانی جان سے جن کے گھر میں وہ رہتا تھا کہے گا کہ دوپہر کے وقت کسی کو اس کے کمرے میں یا کمرے کی طرف بھی نہ آنے دیا کریں اور سخت تیوری چڑھا کر اس نے اپنی گردن پھرائی کہ دروازہ کی طرف دیکھے کہ یک دم دروازہ کھلا اور ایک لڑکی اندر داخل ہوئی۔ کھلے پائچوں کا پیازی چھکے کا پاجامہ اور سفید بوسکی کا قمیص اور سفید دوپٹہ، مگر کہاں کا دوپٹہ، اور کہاں کا قرینہ، بھویں تنی ہوئیں، ہونٹ بھنچے ہوئے، سانس چڑھی ہوئی، چہرہ بیر بہوٹی بنا ہوا آتے ہی بولی " بھائی جان آپ کو سونے کے سوا اور بھی کچھ آتا ہے؟" مگر الفاظ ایسی تیزی اور جوش میں کہے گئے تھے کہ سلیم ایک لمحہ کے لئے اپنے غصہ کو بھول گیا۔

"کیوں کیا ہو گیا؟ میں نے کیا کیا ہے؟"

"کیا کیا ہے! آپ تو کچھ کرتے ہی نہیں، سوئے رہتے ہیں، یا پڑھتے رہتے ہیں اور کوئی کام ہی نہیں"۔

"تو اور کیا کروں؟"

اور کیا کروں یہ خوب ہے! کتاب لی اور کونے میں گھس گئے۔ یہ بھی کیا جیسے دُنیا بستی ہی نہیں"۔

"تو آخر کہو نا، ہے کیا بات، یوں جلال کیسے آگیا، بیٹھ تو جاؤ نا، آخر میری تو طبیعت ہی ایسی ہے"

"اسی بات پہ تو مجھے غصہ آتا ہے۔ لاکھ سر ٹپکو آپ پر کوئی اثر ہی نہیں ہوتا . . . . ."

"پہلے بیٹھ تو جاؤ نا، زبیدہ آخر بات کیا ہے، کوئی خاص بات ہے کیا، کہیں کسی کو وہ جو سیڑھیوں میں بھڑوں کا چھتہ ہے، وہاں کسی بھڑنے کاٹ کھایا ہے؟ میں نے آج کہا جو تھا کہ شام کو اسے ضرور جلا دوں گا، واقعی بہت تکلیف دیتے ہیں بدتمیز . . . ."

جی! آپ کو تو ہر وقت مذاق سوجھتے ہیں، میں نہیں میٹھتی وٹھتی کوئی جانے میں تو باؤلی ہوگئی ہوں۔

"نہیں نہیں میں کب کہتا ہوں" مسکراتے ہوئے۔ "دیکھو زبیدہ بیٹھ جاؤ اور پھر سب کہانی کہہ دو۔"

"توبہ توبہ بھائی جان خدا آپ کو عقل دے آپ کیسی باتیں کرتے ہیں۔ آپ کے خیال میں سب باتیں کہانیاں قصے ہیں کوئی سروکار ہی نہیں، چچا جان کے لڑکوں نے تو ناک میں دم کر رکھا ہے . . . . ."

"بس وہی!!" سلیم اب چوکنا ہوکر بیٹھ گیا۔ "خدا کے لئے مجھے ایسے فضول جھگڑوں میں مت ڈالو تمہیں تو شاید ان باتوں میں مزا آتا ہے مجھے تو مطلقاً کوئی دلچسپی نہیں۔"

"جی آپ کو کیوں ہونے لگی تھی، آپ باہر نکلیں تو آپ کو پتہ چلے۔"

"تو تم ہی کیا باہر پھرتی رہتی ہو؟"

"میں نہیں پھرتی کہ اور بھی کوئی نہیں پھرتا، انور نہیں پھرتا، احمد نہیں پھرتا، سلمیٰ نہیں پھرتی۔ نوکر نہیں پھرتا!"

"تو میں کیا کروں؟"

"آپ کیوں کریں، آپ کی بلا کرے آپ کتاب لیں اور اپنے بل میں گھس جائیں"

"دیکھو زبیدہ" سلیم نے جھنجلا کے کہا۔ "تم ناحق مجھے تنگ کرتی ہو آخر اس تکرار سے فائدہ؟ اپنا مطلب کہو اب کیا ہوگیا؟ انہوں نے بلوہ کر دیا ہے؟ کسی کو مار دیا ہے؟"

"آپ کو بھی مزا آئے جو کسی کو مار دیں۔ ہے نا؟"

"خدا کی قسم کج بحثی بھی تم پر ختم ہے۔ بتاتی نہیں ہو کیا ہوگیا ہے۔ تم ہی اُن کی باتیں کم کیا کرو نا جو آکے تمہیں ایک بات اُن کی سناتا ہے تم اس کو چار سنا دیتی ہو۔ اور مجھے یقین ہے کہ وہ عورت کیا نام ہے اس کا . . . . وہ . . . . . . ار . . . . . . ربدر، وہ اپنے دل سے بناتی ہے۔ اُن کی چغلیاں کھائیں تمہیں جلایا، تمہاری باتیں اُن سے کہیں، اُن سے بکوایا خود مزا لوٹا"

"جی ہاں، آپ کے بس میں ہو تو ساری دنیا کو دھو ڈالیں۔ وہ تو سب معصوم ہیں۔ ہم ہی لڑاکا ہیں، ہم ہی . . . . . . اور کہہ لو . . . . ."

"میں کیا کہتا ہوں۔ تمہارا تو لڑنے کو جی چاہتا ہے۔ آخر ممانی جان بھی تو ہیں وہ کیوں نہیں مجھے کچھ کہتیں ۔ ۔ ۔ ۔"

"ہاں جی! وہ کیا کہیں۔ جب انہوں نے کہہ کہہ کے دیکھ لیا کہ آپ ٹس سے مس نہیں ہوتے تو وہ بھی چپ ہو بیٹھیں۔ آپ تو ہمیں کو گھرکنا جانتے ہیں۔ دل تو چڑیا کا سا ہے نا، اس دن بھی یونہی بے عزتی کرا آئے۔ یہ بھی کہہ دیں نے زیادتی کی ہے"

"بس آ گئیں ہونا طعنوں پر۔ یہ تو تم لڑکیوں کی اوقات ہے۔ ادھر کی ہو ادھر کی جھٹ طعنہ۔ یہی وجہ ہے نا وہ اس قدر مخالف ہو گئے ہیں معمولی سی بات تھی۔ یہ پاس ہی رہتے تھے سگے چچا کا خاندان۔ اتنا میل جول۔ توبہ توبہ! تم میں سے تو سوئی نہیں نکلتی تھی۔ ایک جگہ کھانا ایک ساتھ سیر۔ رات دن گانا کہ الامان۔ یہ اُودھم مچا کرتا تھا کہ جینا مشکل ہو گیا تھا۔ اب ان کے خون کی پیاسی ہو۔ بس ان کی وہ خورشید یہاں سو گئی تو کیا ہو گیا۔ آگے نہیں کبھی سوئی تھی؟ تمہاری چچی نے منہ پُھلا لیا۔ تمہاری دادی جان تو ہیں ہی ان کی طرف کی، وہ کب بات چھوڑیں۔ ادھر تم! ایک دفعہ جو شروع ہو گئی ہو گی تو کون ختم کرے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"جی آپ کو شرم بھی تو نہ آتی ہو گی۔ قصور سارا میرا ہو گیا۔ سونے کی بات ہی کیا تھی وہ تو اکثر یہاں سوتی تھی، پتہ ونہ کچھ نہیں بے دوڑے یونہی۔ آپ تو ان دنوں کالج میں تھے۔ آپ کو کیا معلوم؟"

"تو تم نے بتا دیا ہوتا! نہ مجھے کسی نے بتایا؟ اور نہ میں اپنا دماغ خراب کرتا پھرتا ہوں ان باتوں پر۔ جہنم میں جائیں وہ سب مجھے کیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"آپ کو کون بتاتا پھرے۔ آپ تو رہتے ہیں آسمان پر۔ دماغ رہتا ہے عرش پر، جب کبھی زمین پر آئے بے عزتی کرا آئے"

"پھر وہی بات! زبیدہ سچ جانو میں بہت جلتا ہوں اس میں بے عزتی کیا تھی۔ ان کا وہ چھوٹا لونڈا قاسم تو پورا فتنہ۔ میں گلی سے گزر رہا تھا بس منہ چڑا کے بھاگ گیا۔ میں کیا کرتا؟ اس کے پیچھے بھاگتا پھرتا؟ میرے ٹھینگے جتنا اونچا ہے وہ بہت اچھا لگتا اس کے پیچھے بھاگتا ہے نا؟ اس میں بے عزتی کیا ہو گئی؟ جب لڑکے ہوئے ہی بدتمیز تو کوئی کیا کرے۔ ہمارا انور کیا کم ہے اس سے؟ میں تو کبھی نہ مانوں!"

"بس آپ کا زور تو اپنوں ہی پر چلتا ہے اور کچھ نہ ہو سکا گھر والوں کو برا بھلا کہہ لیا۔ لڑائی ہم نے شروع کی تھی، روز گلی کوچوں میں ہم لڑتے ہیں؟ منہ ہم چڑاتے ہیں؟ میں تو کہتی ہوں آپ خورشید کی خاطر ان سب کو فرشتہ بتاتے ہیں"

"خورشید! کیوں؟ اس کا اس سے واسطہ ۔ ۔ ۔ ۔ لاحول ولا قوۃ تم بھی عجیب لغو باتیں کرتی ہو، بخدا کوئی اور ہو تو کبھی نہ سنوں! خورشید کا یہاں کیا واسطہ ۔ ۔ ۔ ۔"

"جی ہاں ! ننھے ہی بنے جاتے ہو۔ چچی جان نے تو وہ تقاضے کئے کہ الاماں اور آپ کو کوئی واسطہ ہی نہیں"۔

"تو کس بات کے تقاضے کئے ؟ کچھ بتاؤ تو سہی"

"یہی خورشید کے رشتے کے لئے"

"خورشید کے رشتے کے لئے ؟ کس کے ساتھ"

"کس کے ساتھ ؟ واہ کوئی اور بھی ہے ! میرے ساتھ ہوگا نا ؟" اس پر تو بمشکل زبیدہ اپنی ہنسی روک سکی۔

"لاحول ولاقوۃ تو کیا میرے ساتھ ؟"

"جی نہیں میرے ساتھ !"

"لاحول ولا . . . . ."

"کیوں لاحول کیسی ؟ اس میں حیرانی کی بات ہی کیا ہے۔ خورشید کتنی کامنی سی ہے ایسی دلہن بنے کہ سب کچھ بھول جاؤ"

"میں نہیں مانتا تمہیں تو مذاق کرنے کی علت ہے ، اور خورشید توبہ ! انہیں بھی کیا سوجھی ہے !"

"کیوں اس میں کیا کیڑے پڑے ہیں ، تمہیں کوئی پسند ہی نہیں آتا . . . ."

"اس میں کیڑوں کا سوال ہی کیا ، اپنی اپنی طبیعت ہے مگر ممانی جان نے کیا کہا"

"کیا کہا اور کیا کہتیں ، میں کیا جانوں ؟ ان سے پوچھنے پھرو"

"کیوں اب کیا ہو گیا ؟ بھئی زبیدہ ، تم لڑکی ہو پارہ ہو ؟ کبھی یوں کبھی یوں . . . . ."

"جی یونہی کہتے ہیں ! اپنی تو سناؤ ! آپ کیسے ہیں جوگی ! سنیاسی ! بن باسی !!"

"اب پھر شروع ہوئی ہونا۔ پہلے بتاؤ ممانی جان نے کیا کہا۔"

"جی آپ کو اپنی سوجھی ہے انہوں نے آفت بپا کر دی ہے"

"تو بتاؤ بھی نا۔ میں ایسے کسی کی گردن جالوں کہ کیوں بے میرا منہ کیوں چڑایا تھا۔ یہ چاہتی ہو ؟"

"میں کیا کہتی ہوں ، مجھے کیا ، یہی ہے ، احمد کو ان کے فتنے نے لہولہان کر دیا ہے"

"کیا !!!"

"کچھ نہیں آپ کو کیا ! بیٹھئے کہاں دوڑے جاتے ہیں ، میں یونہی ٹہلنے آگئی تھی آپ سوئیں ، یونہی آپ کو جگا دیا . . . ." اور خود دروازے کی طرف چلتی ہے

"زبیدہ ! کیا ہو گیا ہے تمہیں خود پھر پکڑ لاتا ہے" ابھی لال بھبوکا تھیں اب بے وجہ روٹھی جاتی ہو"

"بے وجہ ! جی بے وجہ !! بس آپ رہنے دیں۔ بیٹھے رہیں اپنے پاس !"

"زیب! ذرا ٹھہرو تو سہی بات تو سنو کیا ہو گیا"

"ہو گیا! کچھ نہیں آپ ہی پتھر کے ہوں تو مجھے کیا ہو۔ آپ پر کسی بات کا اثر بھی ہوتا ہے۔ امی جان کتنی دفعہ کہہ چکی ہیں نیچے آیا کرو۔ دالان میں کبھی آ بیٹھا کرو مگر کیوں آپ کی بلا آئے، وہاں تو ہوتی ہوں میں، وہاں تو ہوتا ہے خورشید کا چچی جان کا اُس فتنے کا ذکر۔ آپ کیوں آنے لگے اب میں جاؤں نا دیکھوں احمد کا اب کیا حال ہے آپ کی بلا جانے، ابا جان دفتر سے آلیں تو کہوں ان سے۔ میں تو یونہی چلی آئی معاف کیجئے"؟

"بھئی غضب ہے! تم کسی طرح بھی مانتی ہو۔ اب احمد کی چوٹ کا غصہ ہے! میرے پڑھنے کا غصہ ہے، نیچے نہ آنے کا غصہ ہے؟ تمہارا پتہ نہیں چلتا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"نیچے آئیں نہ آئیں مجھے کیا غرض!"

"تمہیں تو غرض ہے ہی نہیں، تمہیں کیوں ہو۔ پھر میں ہی نیچے کیوں آؤں۔ یہیں پڑا رہتا ہوں۔ ابھی دو مہینے چھٹیوں کے اور ہیں ۔ ۔ ۔ گذر جائیں گے ۔ ۔ ۔"

"جی ہاں ایک مہینہ بھی آپ نے گذار ہی لیا ہے نا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ واقعی میں یونہی آئی اور آپ کو پریشان کیا ۔ ۔ ۔ ۔"

"اب پھر الٹی میرے سر، میں نے کب کہا میں پریشان ہوا ہوں، سب کچھ دل سے بنا لیتی ہو۔ چلو میں چلتا ہوں۔ دیکھوں تو احمد کو زیادہ چوٹ تو نہیں آئی"

سلیم ابھی اٹھ کے سلیپر پہننے ہی لگا تھا کہ پھر قدموں کی آہٹ ہوئی اور ایک چھوٹا سا لڑکا کوئی آٹھ نو سال کا سر کو پٹی بندھی ہوئی آ داخل ہوا۔

"او ہو تم خود ہی آ گئے احمد ادھر آؤ نا"

"ادھر آ جاؤ ننھے ادھر" زبیدہ جو جانے جانے رک گئی تھی بولی۔

"اب کیوں ضد کرتی ہو زبیدہ! میں اسے پیٹوں گا نہیں۔ سلیم نے یہ کہہ کر احمد کو جو اس کے پاس آ گیا تھا پکڑ لیا اور زبیدہ سے کہا" زبیدہ اب بیٹھ جاؤ، کیوں ناحق مجھ سے خفا ہوئی جاتی ہو بیٹھ جاؤ تھوڑی دیر بیٹھ جاؤ پھر نیچے چلتے ہیں" نیچے چلنے کا سن کر زبیدہ کے چہرے پر ایک گلابی لہر ایک لمحے کے لئے دوڑ گئی مگر وہ ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔

"کیوں احمد کہاں چوٹ لگی۔ زیادہ تو نہیں لگی؟ سلیم نے احمد کو پیار کرتے ہوئے پوچھا

"بھائی جان بہت ہی لہو گیا ہے۔ امی جان نے اکنی دی ہے تب چپ ہوا ہوں"۔

"او چور! تب تو چوٹ بالکل نہیں لگی" سلیم نے ہنستے ہوئے کہا

"ہاں جی بالکل نہیں لگی! اتنے زور سے لگی تھی لہولہان تو ہو گیا۔ نیا قمیص پہن کے آیا ہوں"

"کہاں چوٹ لگی تھی بتاؤ تو سہی، ماتھے پر؟ پیچھے، کہاں لگی ہے؟ کس نے مارا یہ تو بتاؤ؟"

" ماتھے پر لگی ہے اور کہاں لگی ہے۔ اتنے زور سے تو گرا تھا"

"گرا تھا! کیسے؟"

" بھائی جان وہ جو ہے ناحرامی . . . ."

" دیکھ احمد گالیاں نہ دیا کر۔ میں نے تجھ سے کتنی دفعہ کہا ہے۔"

" تو بھائی جان امی جان کہتی تھیں میں نے آپ تھوڑا ہی کہا ہے"

" ان کا کیا ہے وہ تو امی جان ہیں۔ بڑی ہیں تو تو بچہ ہے پھر گالی بکتے ہیں نہ سنوں"

" اچھا جی"

" ہاں تو بتا نا پھر کیسے گرا؟"

" احمد بتا نا کیوں نہیں اس قاسم فتنے نے دھکا دیا تھا اینٹ ماتھے میں گھس گئی" زبیدہ نے کہا۔

" جی"

" کہاں دھکا دیا تھا احمد" سلیم نے پوچھا

" نند کی دکان کے پاس"

" مگر کس طرح؟ تو نے اسے چھیڑا تھا، منہ چڑایا تھا، کیا کیا تھا:"

" ہاں بس قصور اسی کا ہے۔ چپ احمد چلیں پیچھے" زبیدہ نے کہا

" اب بات بھی کرنے دیتی ہو کہ نہیں" سلیم نے جھنجھلا کے کہا" احمد بتا نا کیوں نہیں؟"

" . . . . "

" ارے بتا تا کیوں نہیں تو نے ہی چھیڑا ہو گا بس معلوم ہو گیا"

" جی! میں نے نا میں نے"

" تو پھر کس نے؟ قاسم نے؟ کس طرح بات ہوئی بتا تو سہی نہیں تو میں نند سے جا کر پوچھتا ہوں"

" بھائی جان قاسم ایک آنے کی شکر لینے آیا تھا میں بھی اپنے لئے نارنگی کی مٹھائی لینے گیا تھا اس نے دکان پر شور مچا رکھا تھا۔ میں نے نند سے کہا پہلے مجھے دے، قاسم کہتا تھا پہلے مجھے دے اور ساری دوکان سنبھالے کھڑا تھا۔ میں نے ذرا پرے کیا اس نے اس زور سے دھکا دیا کہ . . . ."

" اچھا تو یہ بات ہے" سلیم نے کہا۔

" جی سارا ماتھا پھوٹ گیا" احمد نے ٹپی کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔ زبیدہ مسکرا پڑی

"ہوں! تو پھر تو نے کیا کیا؟" سلیم نے پوچھا

"جی میں نے تو کچھ نہیں کیا"

"پھر بھی؟ میں تجھے جانتا ہوں، تو بھی کم نہیں کرنے والا۔ اچھا بتا پھر تو بھاگ آیا یا تجھے کوئی پہنچانے آیا؟"

"کوئی نہیں"

"اور قاسم کو کیا ہوا"

"وہ رو پڑا اور کیا ہوا"

"رو پڑا وہ کیسے؟"

"میں نے اس کی شکر کی پڑیا اس کے دے ماری۔ ساری بکھر گئی بس رو ہی تو پڑا"

"ارے! واقعی! یہ تو برا کیا"

"تو بھائی جان اس نے بھی تو مجھے دھکا دیا تھا"

"احمد سچ سچ؟" زبیدہ نے بھی پوچھا

"جی! سارا کرتا لہولہان ہو گیا تھا جب میں گھر پہنچا"

"میں شکر کو پوچھتی ہوں، کرتا تو میں نے بھی دیکھا ہے۔ دوؔنی سا زخم آیا ہے اور اُس کی شکر؟ وہ کون بھرے گا؟ یہ تو بتا"

"بھر دیں گے ہم" سلیم نے کہا "تم بس اُس کو رہنے دو۔ مجھے کہو تو ہو آؤں اُن کے گھر کہ لڑکے کو کیوں مارا ہے"

"جی اب آپ کی بھی بن آئی ہے۔ آپ کو خدا دے! وہ ہوئی نا بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا"

"نہیں نہیں اُن سے جا کر کہتا ہوں کہ اس قاسم نے اُس دن میرا منہ چڑایا تھا آج لڑکے کا سر پھوڑ دیا ہے۔ میں اُس کی کھال ادھیڑ دوں گا" سلیم نے مسکراتے ہوئے کہا

"بس کیجئے! بس! میں جانتی ہوں آپ کو اب شیر ہوئے ہیں۔ چلو احمد چلیں اب بہت بیٹھ لیا"

"نہیں نہیں ٹھہرو میں پیچھے چلتا ہوں۔ اچھا وہ بات تو بتاتی جاؤ زبیدہ ذرا ٹھہرو اب بھاگتی کیوں جاتی ہو زبیدہ۔۔۔۔۔۔۔ زبیدہ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

فیاض محمود

چھائی گھٹا گھنگھور

کالے کالے بادل آئے، چھائے چاریوں اُور
سکھی ری، چھائے چاریوں اُور
ہوا چلے اور بوند برسیں، بن میں ناچے مور
سکھی ری، بن میں ناچے مور
چھائی گھٹا گھنگھور، سکھی ری چھائی گھٹا گھنگھور

اندر لوک میں باجا باجے، ہوا مچاوے شور
سکھی ری، ہوا مچاوے شور
کالی کالی رات ڈراوے، جیا گھبراوے مور
سکھی ری، جیا گھبراوے مور
چھائی گھٹا گھنگھور، سکھی ری، چھائی گھٹا گھنگھور

رات اندھیری چھائے کھاوے، کیسے ہوئے بھور
سکھی ری کیسے ہوئے بھور؟
مور سکھی کوئی گیت سناوے، گلا سہانا تور
سکھی ری، گلا سہانا تور
چھائی گھٹا گھنگھور، سکھی ری، چھائی گھٹا گھنگھور

سید مقبول حسین

(از کاؤنٹ ٹالسٹائی)

شہباز نام کا ایک کسان ایک قصبہ میں رہا کرتا تھا اور رہتا بھی اچھی طرح تھا۔ اُس کی صحت بہت اچھی تھی وہ گاؤں بھر میں سب سے اچھا کام کرنے والا تھا۔ اس کے تین جوان بیٹے تھے۔ جن میں سے ایک کی شادی ہو چکی تھی۔ دوسرے کی بات ٹھہر چکی تھی تیسرا ابھی نسبتہً کم عمر تھا کہ اس نے ابھی گھوڑوں کی رکھوالی اور ہل چلانے کا کام سنبھالا ہی تھا۔ شہباز کی بوڑھی بیوی اشیرین بڑی ہوشیار اور اچھی منتظم اور سگھڑ عورت تھی۔ اور بہو بھی امن پسند اور خاموش اور محنتی تھی۔ بس شہباز کا اب یہی کام تھا کہ وہ اپنے خاندان میں مزے سے رہے سہے۔ اس کے گھر میں اگر کوئی بیکار آدمی تھا تو صرف اس کا بوڑھا ناتوان باپ تھا کہ متواتر چھ برس سے وہ گھر کے چولھے کے سامنے دمہ کا دُکھ پڑا برداشت کر رہا تھا۔ شہباز کے گھر میں خدا کا دیا سبھی کچھ تھا۔ اور بمقدار کثیر۔ تین گھوڑے، ایک بچھیرا، ایک گائے ایک بچھڑا اور پندرہ بھیڑیں اس کی ملک تھیں۔ گھر کی عورتیں نہ صرف اپنے مردوں کے کپڑوں میں پیوند ہی لگا دیا کرتی تھیں بلکہ ان کے علاوہ کھیتوں میں ان کا ہاتھ بھی بٹاتی تھیں۔ گھر کے مرد بھی کھیتوں میں سخت مشقت کا کام کرتے تھے پہلی فصل کا اناج نئی فصل آنے تک رہتا تھا۔ وہ اپنی جئی کی فصل سے سرکاری لگان باقاعدہ ادا کرتے اور اپنی تمام واجبی ضروریات پوری کیا کرتے تھے۔ شہباز کا یہی کام تھا کہ وہ اپنے خاندان میں امن اور چین سے رہے سہے۔

شہباز کے پڑوس میں بلکہ اس کے گھر سے ملتی ہوئی دوسری جھونپڑی میں جلال بن غنی نام کا ایک اپاہج بھی رہا کرتا تھا۔ بدقسمتی سے ان میں ایک بات کا بتنگڑ بن کر لڑائی شروع ہوگئی۔

جب تک جلال کا باپ غنی زندہ رہا اور ادھر شہباز کا باپ اپنے گھر کا منتظم تھا یہ کسان ایسے اچھے ہمسایوں کی طرح رہتے تھے کہ دوسروں کے لئے نظیر تھے اگر ان کی عورتوں میں سے کسی کو چھلنی، پیپے کی اور مردوں کو جھول، بورے یا نئے پہیئے کی ضرورت پڑتی تو وہ خوشی سے ایک کے آنگن یا کھیت سے دوسرے کے آنگن یا کھیت میں بھیج دیا کرتے تھے۔ اور اچھے ہمسایوں کی طرح ایک دوسرے کا ہاتھ بٹاتے اور ایک دوسرے کی ضروریات کو پورا کرنے کا خیال رکھا کرتے تھے۔ اگر اتفاقاً کسی کا بچھڑا دوسرے کے کھلیان میں گھس جاتا تو وہ خاموشی سے نکال دیتا ہے اور کہتا بھی تو صرف اتنا کہ "دیکھو بھائی پھر اسے ادھر نہ آنے دینا" ابھی ہم نے غلہ اور بھوسا اٹھایا نہیں، ورنہ جہاں تک چیزوں کے چھپانے تالے میں رکھنے اور کھلیان اور باڑے کو بند رکھنے کا تعلق ہے یا آپس کا جھگڑا۔ ایسی باتیں کبھی ظہور میں نہ آتی تھیں۔ جب تک

بڑے بوڑھوں کا سایہ سر پر رہا یہ لوگ اسی طرح امن چین سے رہے۔ لیکن جب نئی پود نے سر اٹھایا اور کاروبار ان کے ہاتھ میں آیا تو معاملہ ہی دگرگوں ہو گیا۔ پہلی بساط ہی تلپٹ ہو گئی۔ یہ ساری بلا آئی کہاں سے محض ایک ذرا سی بات سے
کہیں شہباز کی بہو کی ایک چھوٹی سی مرغی نے موسم سے پہلے ہی انڈے دینا شروع کر دئے تھے۔ نوجوان دلہن نے آنے والی ایک خوشی کی تقریب کے لئے انہیں جمع کرنا شروع کر دیا حسب معمول ہر روز انڈے کے لئے وہ مرغیوں کے دڑبے کی طرف جاتی جو باڑے ہی میں تھا۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ کسی دن کہیں مرغی کو بچوں نے ڈرا کر وہاں سے بھگا دیا اور مرغی ہمسائے کی باڑ پھاند کر ان کے ہاں انڈے دینے لگی۔ نوجوان دلہن نے کبھی مرغی کے کڑکڑانے کی آواز سن لی تھی۔ اس نے دل میں سوچا" کہ میرے پاس وقت نہیں۔ ابھی کچھ فرصت ملے تو پہلے مجھے گھر میں صفائی ستھرائی کرنی ہے کام کر کے پھر جاؤں گی اور انڈے لے آؤں گی۔ جب شام ہوئی تو وہ باڑے میں گئی۔ دڑبے کو اس نے دیکھا بھالا مگر انڈا وہاں کہاں تھا۔ نوجوان دلہن نے اپنی ساس اور دیور سے پوچھا کہ کہیں انہوں نے انڈا تو نہیں اٹھایا۔ انہوں نے کہا" نہیں ہم نے تو اٹھایا نہیں"۔ لیکن طفیل اس کے سب سے چھوٹے دیور نے کہا کہ تمہاری مرغی نے ہمسائے کے باڑے میں انڈے دینے شروع کر دئے ہیں۔ وہیں سے اس کے کڑکڑانے کی آواز آتی تھی اور وہ وہیں سے اڑتی ہوئی ادھر آئی بھی ہے۔

نوجوان عورت نے اپنی ننھی مرغی کی طرف دیکھا۔ وہ قریب ہی ایک مرغ پٹھے کے پاس بیٹھی اونگھ رہی تھی آنکھیں اس کی بند تھیں۔ اگر مرغی کے زبان ہوتی اور وہ اس کے سوال کا جواب دے سکتی تو وہ اس سے ضرور پوچھ لیتی کہ انڈا کہاں ہے۔ اس لئے نوجوان عورت ہمسایہ کے ہاں گئی۔ بوڑھی ہمسائی دروازہ کے باہر آ گئی اور بولی "بہن پڑوسن کیا چاہتی ہو؟"

"چچی! میری مرغی اڑ کر آپ کے باڑے میں آ گئی تھی۔ ممکن ہے اس نے ادھر انڈا بھی دے دیا ہو"

"ہم نے تو مطلق نہیں دیکھا اور یوں بھی خدا کا شکر ہے ہماری اپنی مرغیاں ہی کب سے انڈے دے رہی ہیں۔ ہم اپنی مرغیوں کے انڈے تو البتہ اکٹھے کرتے ہیں لیکن ہمیں دوسروں کے انڈوں کی ضرورت نہیں اور ہم دوسروں کے باڑوں میں اپنی مرغیوں کے انڈے کبھی اکٹھے کرنے نہیں جاتے۔

یہ تو نوجوان عورت کی ہتک تھی۔ اس لئے اس نے بھی وہ وہ سنائیں جو کہنی زیبا نہ تھیں۔ بی ہمسائی کیا کم تھیں انہوں نے اسی انداز سے جواب دئے۔ اب تو عورتیں ایک دوسرے پر گرجنے برسنے لگیں۔ شہباز کی بیوی پانی پینے آئی تو اس نے بھی ایک آدھ بات کہی یہ سن کر جلال کی بیوی اپنے مکان سے جھپٹ کر نکلی اور اس نے اپنی ہمسائی کو ملزم بنانا شروع کیا۔ اس نے گڑے مُردے اکھاڑے پرانے بکھیڑے جو کبھی کے فراموش ہو چکے تھے اور نئی باتیں جن کا کبھی ظہور نہ ہوا تھا بیان کیں اور اب تو باقاعدہ جنگ شروع ہو گئی۔ محاذ قائم ہو گیا اور طوفان جوش میں آ گیا

سب کی سب چلاتی تھیں چیختی تھیں اور کوشش کرتی تھیں کہ ان کی زبانیں ایک وقت میں دو دو الفاظ کہہ ڈالیں اور لفظ بھی وہ! کہ خدا کی پناہ! ہرے اور گندے ۔ "تم ایسے اور تم ایسے"۔ "تم چور ہو"۔ "تم پھوہڑ ہو" تم اپنے بوڑھے سسر کو بھوکا مارتی ہو"۔ ارے چڑیل میں تجھے پہچانتی ہوں تو نے تو میری چھلنی میں اور سوراخ بنا ڈالے تھے اور تو نے ہمارا مشکیزہ چرا لیا تھا۔ کرو واپس اب اگر شرم والی ہو۔ مجھے اس کی ضرورت ہے" باتوں باتوں میں مشکیزے پر قبضہ کیا۔ اس کا پانی گرا دیا۔ ایک دوسری کی شال کی دھجیاں اڑا دیں اور لگیں ہاتھا پائی کرنے۔

اس وقت جلال بھی کھیت سے گھر میں داخل ہوا۔ تو اس نے اپنی بیوی کی طرف داری شروع کر دی۔ اتنے میں شہباز اور اس کے بیٹے بھی آن پہنچے اور آپس میں گتھم گتھا ہو گئے۔ شہباز شہ زور کسان تھا۔ اس نے ایک ایک کو اٹھا اٹھا کر ادھر ادھر پھینک دیا اور جلال کی داڑھی نوچ لی۔ لوگ بھی اکٹھے ہو گئے تھے مگر ان کو ایک دوسرے سے جدا کرنا مشکل کام تھا۔

بس یہ تھی تباہی کی ابتدا۔ جلال نے اپنی نچی ہوئی داڑھی کے بال ایک کاغذ میں لپیٹ لیے اور ضلع کی عدالت میں شہباز کے خلاف مقدمہ دائر کر دیا۔ عدالت میں بیان دیتے ہوئے اس نے کہا "میں نے یہ داڑھی اس لئے نہیں بڑھائی تھی کہ وہ خنزیر کے سے سر والا شہباز اسے نوچ ڈالے"۔

جلال کی بیوی نے ہمسایوں میں بیٹھ کر کہنا شروع کیا کہ اب شہباز ہمارے پیچ میں آ جائے گا اور اسے ہمیں نکالا نہ دلایا تو ہمارا نام نہیں۔ اسی طرح باہمی منافقت روز بروز بڑھتی چلی جا رہی تھی۔

جھگڑے کے پہلے دن ہی سے بوڑھے نے اندر پڑے پڑے ہی صلح صفائی کرانا چاہی، لیکن نوجوان اس کی بات کہاں سنتے تھے۔

اس نے ان سے کہا "میرے بچو تم نادانی کر رہے ہو۔ اور یہ بڑی نادانی کی بات تھی جس پر لڑائی شروع ہوئی تم سوچو تو سہی۔ ارے یہ ساری لڑائی کیا صرف ایک حقیر سے انڈے پر نہیں شروع ہوئی۔ چلو فرض کر لو کہ ان کے بچوں نے انڈا اٹھا ہی لیا تھا تو تم نے کیوں نہ ان کے پاس رہنے دیا۔ ایک انڈے کی بھی کوئی بساط ہے۔ یہ بھی کوئی بڑی متاع ہے۔ خدا سب کو بکثرت دے رہا ہے۔ مانا کہ ہمسائی نے تمہیں کوئی برا لفظ کہا تھا۔ تم اس کی اصلاح کر دیتے۔ تم اس کے بجائے بہتر باتیں اس کو کہتے۔ خیر لڑائی تو ہو چکی اور ہم سب گناہ گار ہیں۔ ایسی باتیں بھی ہو ہی جایا کرتی ہیں لیکن اب بھی اگر تم جھگڑے کو طول دیتے جاؤ گے تو نتیجہ تمہارے لئے بد سے بدتر ثابت ہوگا۔

نوجوانوں نے اس کی بات پر قطعاً توجہ نہ کی۔ بلکہ انھوں نے کہا کہ بڈھا سٹھیا گیا ہے اور بیکار باتیں کر رہا ہے یونہی بک رہا ہے اور بوڑھوں سے اس کے سوا ہو ہی کیا سکتا ہے۔

شہباز اپنے پڑوسی سے دبنے والا یا اپنی بھول ماننے والا کب تھا بولا کہ میں نے اس کی داڑھی نہیں نوچی خود

اس نے نوچی اور نام میرا بدنام کیا لیکن اس کے بیٹوں نے تو میری آنکھیں تک حلقوں سے نکال ڈالیں اور میرا قمیص پیچھے سے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔ لو یہ دیکھو تو۔"

شہباز نے بھی عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا۔ مقدمہ کی سماعت حاکم ضلع کی عدالت میں ہونے لگی۔ ابھی جب کہ مقدمہ جاری تھا کہیں۔ جلال کے چھکڑے کی ایک ڈھبری گم ہو گئی اور جلال کے گھر کی عورتوں نے شہباز کے بیٹے پر اس کے چرائے جانے کا الزام لگا دیا۔

وہ بولیں کہ ہم نے اپنی آنکھوں سے اسے کھڑکی میں سے اندر آتے دیکھا ہے اور جب وہ چوری کر کے واپس آرہا تھا تو اسے فقیرنی نے شراب خانے کے پاس رکتے دیکھا اور وہ شراب فروش کے ہاتھ بیچنا چاہتا تھا۔

اب ایک اور مقدمہ شروع ہو گیا اور ادھر گھر میں ہر روز ایک نہ ایک نئی تکرار اور لڑائی ہو ہی جاتی تھی۔ چھوٹے بچوں نے بھی اپنے ماں باپ کی دیکھا دیکھی آپس میں لڑنا شروع کیا۔ عورتیں جب گھاٹ پر پانی بھرنے جاتیں تو وہ پانی نکالنے کے لئے اتنے ہاتھ نہ چلاتی تھیں جس قدر ان کی زبانیں چلتی تھیں مگر سب بے کار۔

پہلے پہلے تو مرد زبانی ہی ایک دوسرے پر الزام دھرا کرتے تھے مگر پھر تو یوں ہوا کہ جو جس کے ہاتھ لگتا وہ اس کو غائب کر دیتا تھا۔ عورتوں اور بچوں نے بھی اس اڑن چھو کرنے والے فن میں کمال پیدا کر لیا تھا۔ آہستہ آہستہ ان کی زندگی بد سے بدتر ہوتی چلی گئی۔

شہباز اور جلال کے مقدمے پنچایت میں ہوئے۔ حاکم ضلع کی عدالت اور جسٹس آف دی پیس کے سامنے ہوئے حتیٰ کہ حکام اور عدالتیں ان کے مقدمات کی سماعت کرتے کرتے تنگ آ گئیں مقدمہ یا جلال کے حق میں ہوتا تھا اور شہباز کو سزائے قید و جرمانہ ہوتی تھی یا جلال سزا پاتا تھا۔ لیکن جوں جوں وہ ایک دوسرے کو نقصان پہنچاتے جاتے تھے وہ ایک دوسرے کے زیادہ دشمن ہوتے چلے جاتے تھے کیونکہ قاعدہ ہے کہ جب کتے آپس میں لڑنے لگتے ہیں تو جتنا وہ ایک دوسرے کو چیرتے پھاڑتے ہیں اسی قدر وہ اور بپھرتے اور تند خو ہو کر لڑنے لگتے ہیں۔ اگر لڑتے ہوئے کتوں میں سے کسی ایک کی پیٹھ پر کوئی اور شخص کچھ مار دے تو کتا خیال کرتا ہے کہ مجھے دوسرے کتے ہی نے کاٹا ہے۔ اس پر وہ اور غصے میں آ جاتا ہے۔ یہی حال ان کسانوں کا تھا۔ ان کی مقدمہ بازی جاری رہی۔ جب ان میں سے کبھی کسی کو سزائے جرمانہ یا گرفتاری ملتی تو ان کے دل پہلے سے زیادہ ایک دوسرے سے نفرت کرنے لگتے تھے۔ ہر ایک یہی کہا کرتا تھا کہ "ٹھہرو ابھی تو مجھے تم سے اور سمجھنا ہے"۔

یونہی ان کے مقدمات نے چھ سال تک طول کھینچا اور ابھی تک جھونپڑی میں پڑا رہنے والا بوڑھا معذور کچھ نہ کچھ کہتا چلا جاتا تھا اور ان کو قائل و معقول کرنے کی فکر کیا کرتا تھا۔ "میرے بچو! تم کیا کر رہے ہو؟ ان سب جھگڑوں کو چھوڑ دو اور اپنے کام دھندوں سے بے پروائی نہ کرو اور کسی کے خلاف کینہ کپٹ اپنے دل میں نہ رکھو یہ تمہارے لئے ان مقدمہ بازیوں

سے کہیں بہتر ہوگا کیونکہ جس قدر غصہ میں آگ سے شعلہ ہوتے چلے جاؤ گے نتیجہ خراب سے خراب تر اور برباد ہی ہوتا جائے گا مگر وہ لوگ بوڑھے کی بات پر کان ہی نہ دھرتے تھے۔

ان جھگڑوں پر ساتواں برس گذر رہا تھا کہ ایک دن بھرے مجمع میں ایک شادی کے موقع پر شہباز کی بہو نے جلال کی ہتک کر ڈالی۔ اُس نے جلال پر گھوڑوں کی چوری کا الزام لگایا۔ جلال بدقسمتی سے نشہ میں تھا۔ وہ اپنا غصہ قابو میں نہ رکھ سکا اور اس نے عورت ذات کو پیٹ ڈالا اور اس سختی سے پیٹا کہ وہ ہفتہ بھر بستر پر پڑی رہی۔ شہباز اس حادثہ پر خوش ہوا اور ایک مجسٹریٹ کے پاس جلال کی گرفتاری کے وارنٹ نکلوانے کے لئے جا پہنچا۔

اس نے دل میں خیال کیا کہ "اب تو میں اپنے اس پڑوسی سے حساب صاف ہی کر کے رہوں گا۔ اب یہ جیل یا کالے پانی سے نہیں بچ سکتا" لیکن شہباز مقدمہ ہار گیا۔ مجسٹریٹ نے اس کی عرضداشت قبول نہ کی۔ عورت کا بھی معائنہ کیا گیا۔ جب وہ عدالت میں کھڑی ہوئی تو اس کے جسم پر کسی قسم کے زدوکوب کے نشانات نہ پائے گئے۔ آخر شہباز کو عدالت گردی سے پریشانی ہوئی۔ اس نے جج کے سیکرٹری کے ساتھ ساز باز کیا۔ آخر اس رشوت خوری کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسے اتنی کامیابی ہوئی کہ جلال کے لئے سزائے تازیانہ کا فیصلہ کیا گیا۔

جلال کو عدالت کا فیصلہ مثل خوان نے پڑھ کر سنا دیا۔ جو یوں تھا کہ "عدالت حکم دیتی ہے کہ جلال مزارع عدالت کے سامنے بیس کوڑے کی سزا پائے۔" شہباز نے بھی فیصلہ سنا اور جلال کی طرف دیکھا۔ گویا کہہ رہا تھا "اب اس پر کیسی بنے گی" جلال نے بھی سنا۔ فیصلہ سن کر اس کا رنگ فق ہو گیا۔ وہ مڑا اور ساتھ کے کمرے میں چلا گیا۔ شہباز بھی اس کے پیچھے داخل ہوا۔ کہ اپنے گھوڑے پر سوار ہو۔ لیکن اس نے سنا کہ جلال کہہ رہا تھا۔ بہت اچھا یہ میری پیٹھ پر کوڑے لگوا سکتا ہے۔ کیا ہوگا یہی نا کہ میری پیٹھ جلنے لگے گی۔ لیکن اسے اس سے بھی زیادہ خرابی کا منتظر رہنا چاہئیے۔"

شہباز نے یہ الفاظ سن لئے۔ سنتے ہی فوراً حکام کی طرف مخاطب ہو کر بولا "منصف جج۔ اس نے مجھے دھمکی دی ہے کہ میرے گھر میں آگ لگا دے گا سن لیجئے۔ اس نے یہ بات اور گواہوں کے سامنے کی ہے۔"

جلال واپس بلایا گیا۔

"کیا یہ سچ ہے کہ تم نے ایسا کہا؟"

میں نے کچھ بھی نہیں کہا۔ میری پُشت پر کوڑے لگائیے کہ آپ کے ہاتھ میں آج طاقت اور حکومت ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ میں حق بجانب ہوں مگر دُکھ اٹھانے کے لئے میں ہی تنہا رہ گیا ہوں اور اسے من مانی کرنے کے لئے آزاد چھوڑ دیا گیا ہے"

جلال کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا لیکن اس کے ہونٹوں اور رخساروں میں کپکپی شروع ہو گئی۔ اس لئے اُس نے اپنا منہ دیوار کی طرف پھیر لیا۔ جب ججوں نے جلال کی یہ حالت دیکھی تو وہ بھی اس کے انداز سے گھبرا گئے۔

انہوں نے خیال کیا کہ اب فرض کرو کہ یہ شخص واقعی اپنے ہمسایہ کو کچھ گزند پہنچانے کے لئے ٹھان ہی لے تو؟ اس خیال کے زیر اثر بوڑھے جج نے کہنا شروع کیا کہ بھائیو! دیکھو تو سہی کیا ہی بہتر ہو تا کہ تم لوگ اپنے دلوں سے غصہ نکال کر پھر سے آپس میں دوستانہ کر لو۔ بھیا جلال کیا تم نے حاملہ عورت پر دست درازی کر کے کچھ اچھا کام کیا۔ یہ تمہاری خوش قسمتی ہے کہ خدا نے اس کی جان بچا لی۔ ورنہ یہ کتنا بڑا گناہ ہوتا۔ اور پھر حق کیا ہے۔ اقبال کر لو اور اپنے پڑوسی سے معافی مانگ لو اور یہ بھی تمہیں معاف کر دے گا تو ہم بھی اپنا فیصلہ بدل دیں گے۔"

جب کلرک نے یہ سُنا تو بولا "یہ نہیں ہوسکتا۔ دفعہ ۷ اکے مطابق یہ کوئی آپس کا پرامن سمجھوتا نہ تھا۔ جج کا فیصلہ صادر ہو گیا اور جج کے فتوٰی کی ضرور تعمیل ہو کر رہے گی۔"

جج نے کلرک کی بات پر کچھ توجہ نہ کی۔ "غالباً بولنے کے لئے تمہاری زبان میں کھجلی ہو رہی تھی۔ ہمارے نزدیک صرف ایک ہی دفعہ ہے اور وہ پہلی ہی دفعہ ہے کہ خدا کو یاد رکھو اور خدا نے حکم دیا ہے کہ تم آپس میں میل ملاپ کر لیا کرو۔" اس کے بعد جج نے کسانوں کو ہر چند سمجھوتے کے لئے آمادہ کیا۔ مگر بے کار۔ جلال نے اس کے الفاظ پر کچھ توجہ نہ کی۔

اس نے کہا میری عمر تقریباً پچاس سال کی ہے۔ میرا ایک بیٹا بیاہا ہوا ہے بیس عمر بھر میں کبھی پیٹا نہیں گیا تھا لیکن اب اس خنزیر صفت شہباز کی بدولت میری پیٹھ پر کوڑے بھی لگائے گئے۔ اس پر مجھی سے کہا جاتا ہے کہ میں معافی مانگوں۔ اچھا اگر یہ بھی ہو گا تو چاہئے کہ شہباز میرا انتظار کرے۔

جلال کی آواز میں پھر تھرتھری تھی۔ وہ اس سے زیادہ نہ کہہ سکا۔ وہ مڑا اور باہر چلا گیا۔

عدالت سے مکان کسی قدر فاصلہ پر تھا۔ اس لئے شہباز مکان پر دیر سے پہنچا۔ عورتیں ریوڑ کو باہر سے لانے کے لئے جا چکی تھیں۔ اس نے اپنے گھوڑے کا ساز اتارا اور سامان کو مناسب جگہوں پر رکھ کر گھر کے اندر داخل ہوا۔ بچے کھیتوں سے ابھی واپس نہ آئے تھے۔ عورتیں بھی ابھی جانوروں کے ساتھ ہی میدانوں میں تھیں۔ شہباز مکان میں داخل ہوا۔ ایک تپائی پر بیٹھ کر اپنے ہی خیالات کے سمندر میں غوطے کھانے لگا۔

اسے یاد آیا کہ کس طرح جلال کے سامنے مقدمہ کا فیصلہ پڑھا گیا اور وہ کس طرح سن کر زرد پڑ گیا اور اس نے اپنا منہ دیوار کی طرف پھیر لیا۔ اس خیال کے آتے ہی اس کا دل ڈوب گیا۔ اس نے اپنے آپ کو اس کی جگہ خیال کیا کہ گویا اسی کو کوڑے کھانا تھا۔ اب اسے جلال پر ترس آنے لگا۔ اس نے سنا کہ اس کا بوڑھا باپ اپنے جھونپڑے میں کھانس رہا تھا۔ اور ایک طرف سے دوسری طرف کو کھسک رہا تھا۔ اس نے اپنے پیر پھیلا دئے۔ پھر زمین پر آ رہا۔ پھر اور کھسکا اور گھسٹتا ہوا تپائی تک آیا اور نیچے بیٹھ گیا۔ اب اس کے لئے مشکل تھا کہ وہ تپائی کے اور قریب ہو سکے۔ کھانسی اٹھی وہ کھانستا رہا اور جب اس کی کھانسی کا دورہ ختم ہو چکا تو اس نے اپنی باہیں تپائی کے کناروں پر رکھ دیں اور کہا

"اچھا! تو کیا اسے سزا دے دی گئی؟"

"ہاں اسے بیس بیس درے لگائے گئے"

"بوڑھے آدمی نے اپنا سر ہلایا"

"شہباز! تم برا کر رہے تھے۔ اس کے لئے نہیں اپنے لئے۔ اب فرض کرو کہ حکام نے بیس بیس درے اس کی کمر پر لگا دیئے تو کیا اس سے تمہیں کوئی فائدہ حاصل ہوگا؟

"شہباز نے کہا۔ وہ پھر کبھی ایسا نہیں کرے گا"

"وہ پھر کیسا نہ کرے گا۔ کیا اس نے کوئی بات اس سے زیادہ خراب کی ہے جو تم خود کر چکے ہو؟"

"شہباز نے پوچھا کیا آپ جاننا چاہتے ہیں کہ اُس نے کیا کیا ہے؟ اس نے غریب عورت کو تقریباً مار ہی ڈالا تھا اور اب وہ ہمارے گھر کو پھونک دینے کی دھمکی دے رہا تھا۔ تو پھر میں کیوں اس سے معافی مانگوں"۔

بڈھے نے آہ بھری اور کہا "شہباز تمہارے لئے تمام دنیا کھلی پڑی ہے۔ جہاں آنا چاہو آؤ جہاں سے جانا چاہو جاؤ۔ اور چونکہ میں جھونپڑے کے ایک کونے میں پڑا رہا کرتا تھا تم خیال کرتے تھے کہ تم سب کچھ دیکھتے ہو اور میں کچھ نہیں دیکھتا۔

نہیں میرے جوان نہیں۔ بلکہ تمہیں کچھ نظر نہیں آتا۔ غصہ نے تمہاری آنکھوں پر پردہ ڈال رکھا ہے دوسروں کی غلطیاں تو تمہاری نگاہ کے سامنے ہیں اور اپنی خطائیں اور کوتاہیاں تمہاری پیٹھ کے پیچھے ہیں تم کہتے ہو کہ اس نے خطا کی گناہ کیا۔ جرم کیا۔ اگر صرف وہی اکیلا خطاوار۔ گناہگار اور مجرم ہوتا تو گناہ اور جرم کا وجود ہی دنیا میں نہ ہونا چاہئے تھا۔ کیا دنیا میں بدی ایک ہی آدمی کی وجہ سے پھیل جاتی ہے اور تالی ایک ہی ہاتھ سے بجتی ہے۔ نہیں بلکہ لڑائی تو ہوتی ہی تب ہے جب دو آدمی ہوں۔ تم اس کے جرائم دیکھ سکتے ہو لیکن تم اپنے جرائم نہیں دیکھ سکتے۔ اگر تنہا وہی برائی کا ذمہ دار ہوتا اور تم نے ہمیشہ بھلائی کی ہوتی۔ تو پھر مطلق اس لڑائی جھگڑے کی نوبت نہ آتی کہو کس نے اس کی داڑھی نوچی؟ کس نے اس کے سوکھے گھاس کے ذخیرہ کو کوڑا کرکٹ بنایا؟ کون اسے عدالتوں میں گھسیٹتا پھرا۔ اس پر بھی تم سب الزام اسی پر دھرتے ہو۔ تمہاری زندگی ہی برائی ہے جو بڑی بری بات ہے۔ میرے بچے میں نے اس طریقہ سے اپنی زندگی نہ گذاری تھی۔ یہ وہ باتیں نہیں جو میں نے تمہیں سکھائی تھیں۔ کیا میں اور اس کا بوڑھا باپ بھی ایک دوسرے سے ایسا ہی سلوک روا رکھتے تھے؟ نہیں ہم تو ایک دوسرے کے اچھے پڑوسی تھے۔ اگر کبھی ان کے گھر میں آٹا نہ ہوتا تھا تو ان کے گھر کی کوئی عورت ہمارے ہاں آتی اور کہتی چچا فاروق ہمارے ہاں آٹا نہیں۔ میں کہتا "جاؤ بیٹی کوٹھری میں جاؤ جتنا آٹا چاہیئے لے لو۔ ان کے ہاں گھوڑے پھرانے والا کوئی نہ تھا تو میں تمہیں سے کہا کرتا تھا جاؤ شہباز بیٹے ان کے گھوڑوں کی دیکھ بھال کرو اور اگر مجھے کسی چیز کی ضرورت ہوتی تھی تو میں ان کے ہاں جایا کرتا تھا۔ وہ کس خوشی سے کہتے "لے لو چچا فاروق"۔ یہ تو تھا ہمارا میل ملاپ اور آپس کا برتاؤ

لیکن اب کیا رنگ ہیں۔ ایک سپاہی یورپ کی جنگ کے حالات سنا رہا تھا۔ سچ پوچھو تو تمہاری لڑائی کچھ یورپ کی لڑائی سے بھی بڑھ گئی ہے۔ کیا یہی زندگی ہے یہ تو ایک گناہ ہے۔ تم کسان ہو اور اپنے گھر کے مالک بھی۔ تم کو ان سب باتوں کی جواب دہی کرنا ہوگی۔ تم اپنے گھر کی عورتوں اور بچوں کو کیا سکھا رہے ہو۔ کیا یہی کہ وہ کتوں کی طرح آپس میں لڑا کریں۔ ابھی شاید کل کی بات ہے کہ اور تو اور یہی تمہارا طفیل جس کی ناک ہر وقت بہتی رہتی ہے اپنی پھوپھی عارفہ اور اس کی ماں کو صلواتیں سنا رہا تھا۔ اور اس کی ماں بجائے اس کے کہ اسے روکتی کھڑی ہنس رہی تھی۔ کیا یہ اچھے لچھن ہیں۔ ان سب باتوں کی ذمہ داری تم پر ہے اور فقط تم پر۔ تم اپنے دل میں غور تو کرو۔ کیا معاملات یونہی رہیں گے۔ تم جو ایک بات کہتے ہو اور میں اس کے جواب میں دو کہتا ہوں۔ تم ایک گھونسا لگاتے ہو میں دو لگاتا ہوں نہیں میرے بچے نہیں کیا خدا کے نیک بندے اس کے پیغمبر یہی باتیں سکھانے کے لئے زمین پر آئے تھے نہیں ہرگز نہیں۔ اگر تمہیں کوئی ناملائم بات کہی جائے تم ضبط کرو۔ صبر سے کام لو۔ خود بدگو کا ضمیر اسے ملامت کرے گا۔ شہباز یہی آسمانی تعلیم ہے۔ یہی روحانی سبق ہے کہ اگر کوئی ایک گال پہ تھپڑ مارے تو دوسرا گال پھیر دو کہ لو بھائی اگر میں مستحق ہوں تو ایک اور لگاؤ۔ اس سے خود تھپڑ مارنے والے کے دل میں کانٹے چبھنے لگیں گے۔ اس کے غصہ کے ہتھیار اس کے جسم سے اتر جائیں گے اور وہ تمہاری بات سننے لگے گا۔ ہمیں تو یہ روحانی تعلیم دی گئی ہے۔ ہمیں غرور و تکبر کی راہوں سے روکا گیا ہے۔ تم کچھ بولتے کیوں نہیں ہو۔ کیا میں سچ نہیں کہہ رہا ہوں؟

شہباز خاموش بیٹھا بوڑھے باپ کی باتیں سنا کیا۔

بوڑھے کو پھر کھانسی کا دورا اٹھا۔ کچھ بلغم نکلا تو اس نے پھر بولنا شروع کیا۔

"کیا تم خیال کرتے ہو کہ آسمانی تعلیم روحانی پیغام غلط ہے۔ اس سے تو تمہاری ہی بہتری مقصود تھی اپنی زندگی پر غور کرو۔ کیا یہ اچھی رہی ہے یا بری۔ جب سے تم میں "یہ جنگ عظیم" برپا ہوئی ہے۔ ذرا حساب تو لگاؤ کہ ان مقدمہ بازیوں میں تم کس قدر روپیہ ضائع کر چکے ہو۔ پھر اپنے مقدموں کی پیروی کے لئے جو سفر تمہیں کرنا پڑے ان میں کیا کچھ صرف ہوا۔ جو پچھلی جمع جتھا تھی وہ بھی کھاپی کر برابر کر چکے۔ یہ تمہارے چھوکرے بھیڑیئے بنتے چلے جا رہے ہیں ضرورت تھی کہ اب تم زندگی کا لطف اٹھا رہے ہوتے۔ مگر ہو تا یہ ہے کہ جو کچھ پاس تھا برباد کر رہے ہو۔ اور یہ سب ہے کیوں؟ ایک نکمی اور بے حاصل بات کے لئے۔ یہ سب تمہارے تکبر و رعونت کا نتیجہ ہے ضرورت تھی کہ تم خود اپنے بچوں کے ہمراہ اپنے کھیتوں میں جاتے اور کھیتوں میں کام کرتے اور اپنے ہاتھ سے پودا لگاتے اور کھدائی نلائی کرتے لیکن شیطان نے تمہیں تمہارے اس فرض سے ہٹا دیا اور تم کبھی ججوں اور کبھی مختاروں کے دروازوں پر ٹھوکریں کھاتے پھرتے ہو تم گھر آتے ہو تو دیر سے اور چونکہ تخم ریزی تم مناسب وقت پر نہیں کرتے۔ زمین بھی اپنے خزانے نکال کر تمہارے سامنے نہیں رکھ دیتی معلوم ہے کہ کیوں اس دفعہ جئی پیدا نہیں ہوئی۔ تم نے اسے کب بویا تھا۔ تم شہر سے کب واپس آئے تھے اور

پھر تم نے کیا کیا تھا۔ اپنی گردن کے لئے ایک اور طوق اور اپنی کمر کے لئے ایک اور بوجھ تیار کیا۔ ارے سمجھ بوجھ سے بیگانے اب بھی وقت ہے کہ تو اپنے کام دھندے کی طرف دھیان دے کھیتوں اور گھر کے کام میں اپنے بیٹوں کا ہاتھ بٹا۔ اگر کوئی تیری ہتک کرے خدا کے نام پر اسے معاف کر تیرے لئے کہیں بہتر ہوگا اور اس سے تیرے دل کو بھی سکھ ملے گا۔"

شہباز نے کچھ نہ کہا

میری بات سنو کہ میں بوڑھا آدمی ہوں۔ جاؤ اپنے گھوڑے پر ساز ڈالو اور سیدھے عدالت میں پہنچو اور اپنے تمام مقدمات سے دست برداری داخل کر دو اور پھر صبح کے وقت جلال کے ہاں جاؤ اور اس سے معافی مانگو۔ اسے اپنے گھر پر دعوت دو۔ کل تعطیل بھی ہے (کہ کل عید ہے) شیرخرما اور شربت شیرے سے اس کی تواضع کرو۔ سب معاملے کو صاف کرو اس طریق سے کہ ایسا واقعہ پھر کبھی پیش نہ آئے۔ اپنے گھر کی عورتوں اور بچوں کو بھی ایسا ہی کرنے کی تاکید کر دو۔

شہباز نے آہ بھری اور دل میں خیال کیا بوڑھا کہتا تو سچ ہے۔ اس کا دل بھی نرم ہو گیا لیکن وہ نہ جانتا تھا کہ اب کس طرح آغاز کرے اور کس طرح صفائی اور صلح کر ڈالے۔

بوڑھے نے پھر بات شروع کی گویا وہ اس کے خیالات پڑھ رہا تھا۔

جاؤ۔ شہباز۔ جاؤ۔ اس میں دیر نہ کرو۔ آگ کو ابتدا ہی میں بجھا دینا چاہیئے ورنہ جب وہ بھڑک اُٹھے تو اس کا بجھانا مشکل ہوتا ہے۔

بوڑھے نے کچھ اور بھی کہنا شروع کیا تھا لیکن اُس نے بات پوری نہ کی کہ عورتیں جھونپڑی میں آ پہنچیں اب تو یوں نظر آنے لگا کہ کوؤں نے سبھا بھری ہے۔ عدالت کی سب خبریں ان کو پہنچ چکی تھیں کہ کس طرح جلال کو دُرّوں کی سزا دی گئی اور کس طرح اس نے گھر کو آگ لگا دینے کی دھمکی دی۔ انہوں نے سب کچھ سن لیا تھا۔ مگر اس میں بہت کچھ اپنی طرف سے اضافہ بھی کر دیا تھا اور واپسی میں انہیں اس بات میں بھی کامیابی حاصل ہو گئی تھی کہ انہوں نے جلال کے گھر کی عورتوں سے لڑائی چھیڑ دی تھی۔

چنانچہ وہ آتے ہی بتانے لگیں کہ جلال کی بہو نے کس طرح ان کو دھمکی دی کہ وہ گاؤں کے مکھیا کو ان کے خلاف بھڑکائے گی۔ یہ بھی بظاہر ان کو نظر آ رہا تھا کہ مکھیا جلال کی جانب داری کر رہا تھا۔ وہ سارے معاملہ کو زیر و زبر کر ڈالے گا۔ سکول ماسٹر صاحب نے بادشاہ کے حضور میں شہباز کے خلاف ایک عرضداشت بھیجی ہے جس میں باغ کا معاملہ اور دوسری چھوٹی موٹی باتیں سب لکھی ہیں۔ اب ہمارا کھیت ان (جلال والوں) کو دے دیا جائے گا۔ جب شہباز نے عورتوں کے لیکچر سنے اس نے پھر اپنا دل سخت بنا لیا اور جلال سے صلح کرنے کا خیال دل سے نکال دیا۔

ایک کسان کے لئے کھیت میں کرنے کے بہت سے کام ہوتے ہیں۔ شہباز نہیں چاہتا تھا کہ عورتوں سے باتیں کرے۔ سو وہ اٹھا اور جھونپڑے سے باہر نکلا اور چلتے چلتے وہاں پہنچا جہاں اس کے کھلیان پڑے تھے قبل اس کے کہ وہ اپنا کام ختم کر کے گھر واپس آتا سورج غروب ہو چکا تھا۔ اس کے لڑکے بھی کھیتوں سے واپس گھر میں آ گئے تھے۔ وہ فصل ربیع کے لئے ہل جوتنے کی تیاریاں کر رہے تھے۔

شہباز ان سے ملا۔ اس نے ان سے ان کے کام کے متعلق دریافت کیا۔ اُس نے آلاتِ کشاورزی کو اپنے اپنے ٹھکانے پر رکھنے میں اُن کی مدد کی۔ اس نے سرائیں کے گھوڑے کا سامان الگ رکھا۔ وہ بلیاں اور ڈنڈے وغیرہ چھپر کے اندر رکھنے کے لئے جانے ہی کو تھا لیکن چونکہ کافی اندھیرا ہو چکا تھا اس لئے اس نے اس کام کو دوسرے دن پر اٹھا رکھا۔ لیکن اس نے جانوروں کو خوب کھلایا اور پھاٹک کھولا کہ طفیل جانوروں کو رات کو چرانے کے لئے باہر لے جائے۔ جانوروں کے نکل جانے کے بعد اُس نے باڑے کا پھاٹک پھر بند کر دیا اور مزید احتیاط کے لئے بانس بھی ادھر ادھر اٹکا دیئے۔ اتنے کاموں کے بعد اُس نے جی میں کہا کہ اب کھانے اور سونے کے لئے گھر جانا چاہیئے۔

اس وقت تک وہ جلال کے متعلق سب کچھ بھول چکا تھا حتیٰ کہ وہ بھی جو اس کے باپ نے کہا تھا۔ ابھی مشکل گھر کے دروازہ کی زنجیر کو ہاتھ ہی لگایا تھا کہ اس نے سنا کہ اس کا ہمسایہ باڑ کے پیچھے سے بھرائی ہوئی آواز میں کسی کو گالیاں دے رہا تھا کہ یہ شیطان کس کام کا یہ مستحق ہے کہ اسے جان سے مار ڈالا جائے۔

جب شہباز نے یہ الفاظ سنے تو اس کا وہی پچھلا غصہ لوٹ آیا جس وقت جلال گالیاں دے رہا تھا وہ تھوڑی دیر تک سنتا رہا اور جب جلال خاموش ہوا تو شہباز بھی اپنے جھونپڑے میں داخل ہو گیا۔ جھونپڑے میں روشنی تھی اور اس کی بہو بیٹھی چرخہ کات رہی تھی۔ اور اس کی بیوی کھانا نکال رہی تھی اور بڑا بیٹا اپنے موزے پر کپڑا لپیٹ رہا تھا اور بڑے سے چھوٹا ایک تپائی کے قریب چھوٹی سی کتاب لئے بیٹھا تھا اور طفیل باہر گھوڑوں کو چرانے کے لئے جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ غرض جھونپڑی میں ہر طرف خوشی ہی خوشی تھی۔ اگر ان کا ایسا برا پڑوسی نہ ہوتا۔

شہباز داخل ہوا تو غصہ میں بھرا ہوا تھا۔ اس نے بنچ پر بیٹھی ہوئی بلی کو پرے دھکیل دیا اور عورتوں کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا کہ ناند مناسب موقع پر کیوں نہیں رکھی گئی۔ شہباز کو بہت غصہ آ رہا تھا۔ وہ بیٹھ کر گھوڑے کی کاٹھی وغیرہ درست کرنے لگا۔ جلال کے الفاظ اس کے دل و دماغ میں طوفان بپا کئے ہوئے تھے کہ کس طرح بر سر عدالت اس نے اسے دھمکی دی اور اب کس طرح کسی کے متعلق کہہ رہا تھا کہ اسے مار ڈالنا چاہیئے۔

گھر کی بڑی بوڑھی نے طفیل کے لئے کھانا تیار کیا۔ کھانا کھانے کے بعد اس نے پوستین اور اس پر ایک اور کوٹ پہنا اور اس پر کمر کو پیٹی باندھی اور تھوڑی سی روٹی ساتھ لی اور اپنے گھوڑے کے پاس چلا گیا۔ اس کا بڑا بھائی چاہتا تھا کہ وہ اس کو باہر پہنچا دے کیونکہ باہر کافی اندھیرا ہو چکا تھا بادلوں نے آسمان کو ڈھانپ رکھا تھا اور سخت

تند جھکڑ چل رہا تھا۔ مگر شہباز اٹھا اور باہر نکل گیا۔ اور اس نے اپنے بیٹے کو گھوڑے پر سوار ہونے میں مدد دی پھر وہ مکرم طفیل کے گھوڑے کی ٹاپ کی آواز سنتا رہا حتیٰ کہ وہ گاؤں کے دوسرے لوگوں سے جا ملا اور یہ سب لوگ بہت دور نکل گئے۔ پھر شہباز دروازے پر دیر تک کھڑا رہا۔ جلال کے یہ الفاظ اس کے دل سے دور نہ ہوتے تھے۔ کہ ممکن ہے کوئی بہت ہی بڑا حادثہ تم کو پیش آئے"

شہباز نے دل میں خیال کیا وہ مایوس ہو چکا ہے۔ تمام فصل خشک ہو چکی ہے۔ اس کے علاوہ ہوا کا بھی زور ہے وہ پچھلی طرف سے احاطہ کے اندر داخل ہو کر آگ لگا سکتا ہے اور یہ ہمارے لئے آفت ہوگی۔ یہ (ناپاک شخص) ہمیں پھونک ڈالے گا۔ اور پھر پکڑا بھی نہ جائے گا۔ اب اگر کسی طرح میں اس پر قابو پا سکتا تو وہ بچ کر نکل نہیں سکتا"

اس وقت شہباز کے دل میں یہی آیا کہ اسے گھر کے سامنے کے دروازے سے اندر نہیں جانا چاہئے اس لئے وہ سیدھا گلی میں گیا اور دروازہ کے پچھواڑے ایک گوشے میں چھپ رہا۔

"نہیں مجھے احاطہ کی طرف جانا چاہئے۔ کون جانتا ہے کہ اس کے دل میں کیا کیا شرارتیں بھری ہیں؟" شہباز آہستگی سے کھسکتا ہوا دروازوں کے باہر کی طرف بڑھا۔ جونہی کہ وہ نکڑ کی طرف مڑا اور اس نے باڑ کی طرف دیکھا اسے معلوم ہوا کہ گویا اس نے سامنے کی نکڑ سے کسی چیز کو حرکت کرتے دیکھا ہے اور یہ کہ کسی نے تاریکی سے سر اٹھایا اور پھر تاریکی میں چھپ گیا۔

شہباز ابھی کھڑا رہا۔ اس نے اپنا سانس روک لیا۔ وہ سن رہا تھا اور اس کی نگاہ سامنے جمی ہوئی تھی۔ سب طرف خاموشی تھی۔ صرف ہوا کا زور اور پتوں اور شاخوں کے آپس میں ٹکرانے کا شور تھا۔ اور غلے کے انباروں میں سے ہوا کی آواز پیدا ہوتی تھی۔ اب جب کہ اس کی نگاہیں تاریکی میں کچھ دیکھنے لگیں۔ تو شہباز کو سب چیزیں ہل چھپر وغیرہ نظر آنے لگیں۔ وہ نظر جما کر دیکھتا رہا لیکن کوئی شخص نظر نہ آتا تھا۔ "یہ غلطی ہوگی" شہباز نے خیال کیا۔ مجھے ایک چکر ضرور لگانا چاہئے۔ وہ چھپر کے ساتھ ساتھ دبے پاؤں چلتا رہا۔ شہباز آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ اپنے ٹٹو کے جوتوں کی آواز وہ خود بھی نہ سن سکتا تھا۔ وہ نکڑ پر پہنچ گیا تو اس نے پرے کنارے پر دیکھا کہ ہل کے نزدیک ایک چمک سی پیدا ہوئی اور لمحہ بھر میں غائب ہو گئی۔ شہباز کے دل میں ٹیس سی اٹھی اور وہیں کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ قبل اس کے کہ وہ دوسرا قدم اٹھاتا پہلی جگہ آگ کی چمک پہلے سے زیادہ زور سے پیدا ہوئی اور اس نے ایک آدمی کو بھی دیکھا جس کے سر پر ٹوپی تھی اور اس کی پیٹھ اس کی طرف کو تھی۔ وہ نیچے کو جھکا ہوا تھا اور گھاس کے ایک مٹھے میں جو اس کے ہاتھ میں تھا آگ سلگانے کی کوشش کر رہا تھا۔

شہباز کا دل اس کے سینہ میں ایک پرندے کی طرح پھڑکنے لگا۔ وہ حواس جمع کر کے آگے بڑھا لیکن اس احتیاط سے کہ اسے اپنے قدم کی آواز خود سنائی نہ دیتی تھی۔

"اب" اس نے دل میں کہا "اب یہ میرے قابو میں ہے اور میں نے اسے آگ لگاتے ہوئے پکڑلیا ہے"۔

لیکن قبل اس کے کہ شہباز دو قدم اور آگے بڑھتا کوئی چیز مشتعل سے مشتعل تر ہو گئی تھی لیکن پہلے سے قطعاً مختلف مقام پر۔ یہ کوئی معمولی آگ نہ تھی۔ اب جو آگ لگی تھی وہ چھپر کے اندر کے کھلیان میں لگی تھی۔ اس کے شعلے گھر کی طرف لپک رہے تھے۔ اور جلال اس کی روشنی میں صاف صاف کھڑا نظر آتا تھا۔

باز کی طرح جو چڑیا پر حملہ کرتا ہے شہباز لنگڑے جلال کی طرف جھپٹا۔

"میں اس کی گردن دبا ڈالوں گا۔ وہ اب میرے پنجے سے بچ کر نہیں جا سکتا"۔ اس نے دل میں کہا لیکن غالباً لنگڑے جلال نے اس کے قدموں کی آہٹ سُن لی تھی۔ اس نے پھر کر دیکھا اور باوجود اپنے لنگڑے پن کے وہ ایک خرگوش کی طرح پھلانگتا ہوا چھناؤ کی طرف چلتا گیا۔

"تم بچ کر جانے نہ پاؤ گے"۔ شہباز نے پکار کر کہا اور اس کے پیچھے اُڑتا ہوا گیا۔

قریب تھا کہ وہ اس کو گلے سے پکڑے۔ مگر جلال اس کے ہاتھ میں سے نکل گیا۔ البتہ اس کے کوٹ کا ایک کنارا اس کے ہاتھ میں آگیا جو پھٹ کر الگ ہو گیا اور شہباز زمین پر گر پڑا۔ "مدد۔ مدد۔ اسے پکڑلو" گرنے کے ساتھ اس کے منہ سے نکلا۔ وہ گر کر اٹھا اور پھر اس کے تعاقب میں دوڑا۔ لیکن اب جب کہ وہ دوبارہ سنبھل کر دوڑا تو اتنے عرصہ میں جلال تقریباً اپنے گھر کے دروازے تک پہنچ چکا تھا۔ شہباز جلال کو پکڑ لیتا مگر اتنے میں کیا ہوا کہ کسی چیز کی سخت چوٹ شہباز کے سر پر پڑی۔ گویا کہ کوئی پتھر تھا جو اس کی کھوپڑی پر آن کر لگا۔ یہ جلال ہی کا کام تھا کہ اس نے قریب پڑا ہوا ایک ڈنڈا اٹھایا اور جب شہباز اس کے قریب آیا تو اس نے اپنے پورے زور سے اس کے سر پر مار دیا۔

شہباز کو تارے نظر آنے لگے۔ دنیا اُس کی نگاہ میں تاریک ہو گئی۔ وہ چکرایا۔ اور بے ہوش ہو کر زمین پر آرہا جب ہوش میں آیا تو جلال وہاں سے جا چکا تھا اور دن کی سی روشنی پھیلی ہوئی نظر آتی تھی۔ اس کے اپنے کھیت کی طرف شور برپا تھا۔ چیزیں لوٹ رہی تھیں اور چیزوں کے جلنے اور گرنے سے آواز پیدا ہو رہی تھی۔ شہباز نے دیکھا کہ چھپر کا پچھلا حصہ تو رخصت ہو چکا تھا اور چھپر کے بازوؤں میں آگ اپنا کام کر رہی تھی۔ آگ کے شعلے اور دھواں اور جلتا ہوا گھانس پھونس جھونپڑے کی طرف بڑھ رہا تھا۔

"اس کا کیا مطلب بھائیو خدا کے لئے کہو" شہباز نے اپنی ران پر ہاتھ مارتے ہوئے چلا کر کہا۔ اس کی ضرورت ہے کہ چھت گرا دی جائے۔ آگ کو پامال کر دیا جائے۔ بھائیو اس کا مطلب کیا ہے؟ اس نے پھر دہرایا۔

اس نے چلانے کی کوشش کی لیکن اُس کی آواز گلوگیر تھی۔ اس نے دوڑنا چاہا لیکن اس کے پاؤں نے جنبش سے جواب دے دیا تھا اور وہ ایک دوسرے میں پھنستے اور الجھتے تھے۔ اس لئے وہ صرف چل سکا جب کہ

وہ لڑکھڑا رہا تھا۔ آخر اس کا سانس سینہ میں اٹکنے لگا۔ وہ لمحہ بھر کے لئے ٹھہرا جب اس کا سانس برابر ہوا تو وہ چلا جب وہ ذخیرہ کے چھپر کی طرف جا رہا تھا اس وقت چھپر کے کنارے بھی آگ کی نذر ہو کر زمین پر گر پڑے تھے اور جھونپڑے کے ایک گوشہ اور دروازے کو بھی آگ لگ گئی تھی۔ جھونپڑے سے آگ کے شعلے بلند ہو رہے تھے۔ دروازے کی سب راہیں کٹ چکی تھیں۔ وہاں لوگوں کا بڑا ہجوم تھا لیکن کسی کے بنائے کچھ نہ بن سکتا تھا۔ پڑوسی آگ کے ڈر سے اپنے اپنے کھلیانوں کو آگ سے پرے لے جا رہے تھے اور اپنے اپنے احاطوں اور باڑوں سے اپنے جانوروں کو باہر نکال رہے تھے۔

جب شہباز کا گھر جل چکا تو جلال کے گھر کی باری آئی جھکڑ چلا اور آگ گلیوں میں پھیل گئی۔ اور آدھا گاؤں راکھ کا ڈھیر بن گیا۔

شہباز کے گھر سے بوڑھا آدمی (شہباز کا اپاہج باپ) بڑی مشکلوں سے نکال لیا گیا اور اس کے گھر کے لوگ تن سر کے کپڑے ہی لے کر باہر نکل سکے۔ باقی سب چیزیں جل چکی تھیں سوائے گھوڑوں کے جو رات کی چرائی کے لئے باہر گئے ہوئے تھے باقی سب چوپائے تباہ ہو گئے۔ مرغی خانے اپنے اڈوں سمیت۔ چھکڑے اور ہل اور سرائوں وغیرہ وغیرہ سب چیزوں کو آگ بھسم کر چکی تھی۔

جلال کے چوپائے بچائے گئے تھے اور اس کی کچھ فصل بھی حفاظت کی جگہ پہنچا دی گئی تھی۔

رات بھر آگ کا دور دورہ رہا۔ شہباز اپنے رہنے کی جگہ کے قریب کھڑا دیکھتا رہا اور یہی کہتا رہا "خدایا اس کا کیا مطلب ہے۔ صرف اس کی ضرورت ہے کہ ان چیزوں کو گرا کر مسل ڈالا جائے۔" لیکن جب اس کے جھونپڑے کی چھت گر پڑی وہ آگ کے قریب گیا اور اس نے جلتی ہوئی ایک بلّی کو پکڑ لیا۔ اور چاہا کہ اسے کھینچ لے۔ عورتوں نے اسے دیکھ لیا اور اسے پیچھے بلانے لگیں۔ اس نے جلتی ہوئی شہتیری کو نکال لیا اور دوسری کو نکالنے کے لئے پھر گیا لیکن چکرا کر آگ ہی میں گر پڑا۔

تب اس کا بیٹا اس کے پیچھے لپکا اور اسے باہر گھسیٹ لایا شہباز کی ڈاڑھی اور سر کے بال جل چکے تھے اس کے کپڑے پھٹ چکے تھے۔ اس کے ہاتھ زخمی تھے مگر ان چیزوں کی طرف اس کا دھیان نہ تھا۔

مجمع میں لوگ کہہ رہے تھے۔ "غم کے مارے اس کے ہوش بجا نہیں رہے"

آگ ٹھنڈی ہونے لگی تھی۔ شہباز اپنی ہی جگہ کھڑا تھا اور یہی کہے جا رہا تھا "اے خدا کے لئے اس کو گرا ڈالو۔"

صبح کے وقت گاؤں کے مکھیا نے اپنے بیٹے کو اسے بلانے کے لئے بھیجا۔

"چچا شہباز تمہارے باپ کا آخری وقت ہے۔ وہ تمہیں بلا کر خدا حافظ کہنا چاہتا ہے۔"

شہباز اپنے باپ کے متعلق سب کچھ بھول چکا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اسے کہا کیا جا رہا تھا۔

"کون باپ" اس نے کہا "کسے چاہتا ہے؟"

"وہ تمہیں بلاتا ہے کہ خدا حافظ کہے۔ وہ ہمارے جھونپڑی میں دم توڑ رہا ہے۔ آؤ ہم چلیں چچا شہباز"

مکھیا کے بیٹے نے یہ الفاظ کہے اور اسے ہاتھ سے پکڑ لیا شہباز لڑکے کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔

بوڑھا آدمی (شہباز کا باپ) جب آگ سے نکالا گیا تو جلتے ہوئے گھانس سے گھرا ہوا تھا اور بری طرح جلا ہوا تھا۔ وہ گاؤں کے مکھیا کے گھر پہنچا دیا گیا تھا جو گاؤں کے سب سے پرے سرے پر واقع تھا اور گاؤں کا یہی حصہ تھا جو آگ سے بھی محفوظ رہا تھا۔

شہباز اپنے باپ کے پاس پہنچا۔ تو وہاں مکھیا کی بوڑھی بیوی کے سوا اور کوئی شخص موجود نہ تھا البتہ چند بچے تھے۔ اور باقی سب لوگ آگ دیکھنے گئے ہوئے تھے۔ بوڑھا آدمی ایک چھوٹی بتی اپنے ہاتھ میں لئے ایک تخت پر آخری سانس گن رہا تھا اور دروازے کو دیکھ رہا تھا۔ بڑھیا مرنے والے کے پاس گئی اور اس سے کہا تمہارا بیٹا آگیا ہے۔ بوڑھے نے اپنے بیٹے سے قریب آنے کو کہا۔ جب شہباز قریب پہنچ گیا تو بوڑھے نے کہا۔

"ہاں شہباز میں نے تمہیں کیا کہا تھا۔ بتاؤں گاؤں کو کس نے جلایا؟"

"اُس نے جلایا۔ باواجی" میں نے خود اسے آگ لگاتے ہوئے پکڑ لیا تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے اُس نے آگ لگا دی۔ میں صرف اتنا چاہتا تھا کہ جلتے ہوئے گھانس کے مٹھے کو باہر نکال کر پامال کر دیا جاتا اگر ایسا ہوتا تو سب کچھ کبھی نہ ہوتا۔

بوڑھے آدمی نے کہا "شہباز میری موت کا وقت آگیا۔ تمہیں بھی مرنا ہے۔ بولو یہ کس کا گناہ ہے؟"

شہباز نے اپنے باپ کی طرف دیکھا۔ اور کچھ نہ کہا وہ ایک لفظ بھی منہ سے نہ نکال سکا۔

"تم خدا کو حاضر ناظر جان کر بولو کس کا گناہ تھا؟"

اس موقع پر شہباز گویا آپ میں آیا اور لسوارے کر بولا۔

"باواجی میرا گناہ تھا" وہ اپنے باپ کے سامنے گھٹنوں کے بل جھک گیا اور سسکیاں لیتے ہوئے بولا باواجی مجھے معاف کیجئے۔ میں آپ کے سامنے بھی اور خدا کے حضور میں بھی خطا دار ہوں"

بوڑھے آدمی نے اپنا ہاتھ ہلایا اور اس نے شمع اپنے دائیں ہاتھ سے بائیں ہاتھ میں تھام لی اور اپنے دائیں ہاتھ سے اپنی پیشانی کی طرف اشارہ کیا گویا وہ خدا کا شکر ادا کرنا چاہتا تھا۔ مگر وہ اپنے ہاتھ کو پورے طور پر نہ اٹھا سکا اور رک گیا۔

"الحمدللہ الحمدللہ" کہہ کر پھر اس نے سختی سے اپنے بیٹے کی طرف دیکھا اور کہا

"لیکن شہباز! شہباز"

"کیا ہے باواجی ؟"

"اب تمہیں کیا کرنا چاہیئے۔تمہیں کیا زیبا ہے"۔

شہباز سسکیاں لیتا رہا۔

"اس نے کہا۔باواجی میں نہیں جانتا۔اب ہماری زندگی کیسے بسر ہوگی"۔

بوڑھے نے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔لبوں کو حرکت دی گویا وہ اپنی طاقت مجتمع کر رہا تھا۔آخر اس نے اپنی آنکھیں کھولیں۔اور کہا تمہاری زندگی خوب بسر ہوگی۔اگر تم خدا سے صلح کرو تو تمہاری خوب بسر ہوگی"۔

بوڑھا بولتے بولتے رکا۔مسکرایا اور بولا

"یاد رکھو شہباز کسی کو مت بتاؤ کہ آگ کس نے لگائی اپنے پڑوسی کا گناہ چھپاؤ اور خدا تم دونوں کو معاف کردے گا۔

بوڑھے نے اپنے دونوں ہاتھوں میں بتی پکڑلی اور چھاتی پر نشان سا بنایا۔پاؤں پھیلا کر لیٹا اور مر گیا۔

شہباز نے جلال کا راز ظاہر نہ کیا اور کوئی نہ جان سکا کہ کس نے آگ لگائی تھی۔اور شہباز کا دل بھی جلال کی طرف سے صاف ہوگیا اور جلال کو بہت حیرت ہوئی کہ شہباز نے اس کے بارے میں کسی سے کچھ نہیں کہا۔کچھ دنوں تک تو جلال کو شہباز سے ڈر لگتا رہا۔لیکن پھر یہ بات جاتی رہی۔جب مردوں نے لڑنا چھوڑا تو ان۔کی گھروالیوں نے بھی لڑائی بند کردی۔جب دوبارہ تعمیر جاری ہوئی تو دونوں گھرانے ایک ہی چھت کے نیچے رہا کرتے تھے اور جب گاؤں بن چکا اور لوگوں کے گھر کھیتوں سے فاصلہ پر چلے گئے تو بھی شہباز اور جلال پہلے کی طرح پڑوسی تھے۔

اب شہباز اور جلال ایسے ہی رہا کرتے تھے جیسے پڑوسیوں کو رہنا چاہیئے جیسا کہ بڑے بوڑھے رہا کرتے تھے۔شہباز کو ہمیشہ بوڑھے کی نصیحت یاد رہی اور خدا کا یہ قانون بھی کہ آگ کو پہلی ہی چنگاری پر بجھا دینا چاہیئے۔اگر کسی کو کوئی نقصان پہنچائے تو وہ بدلہ لینے کی کبھی کوشش نہ کرے۔اگر کسی کو کوئی برا نام دے تو وہ اس کا پلٹ کر جواب نہ دے بلکہ کوشش کرے کہ اسے سکھائے کہ وہ برُے الفاظ کو زبان پر نہ لائے۔یوں وہ اپنے ہونے بچوں کو بھی اچھی تعلیم دے گا۔ اور یونہی شہباز نے اپنی اصلاح کی اور وہ پہلے کے مقابلہ میں بھلے آدمیوں کی سی زندگی بسر کرنے لگا

مہر محمد خاں شہاب

غزل

ترے حسن کو دلرُبا کر دیا
مرے دل نے کیا جانے کیا کر دیا

بہت بے تکلف تھا تیرا مزاج
تجھے ناز سے آشنا کر دیا

تری تو بتو شوخیوں نے مجھے
تلوّن سے ناآشنا کر دیا

ترے اک تبسم نے جانِ جہاں
محبت کو لا اِنتہا کر دیا

قیامت تھی تیری وہ دھیمی نظر
مرا زہد جس نے ریا کر دیا

یہی سوچتا ہوں ترے عشق نے
میں کیا تھا مجھے کیا سے کیا کر دیا

ممتاز حسن

بیتال پچیسی

تقریباً پانچویں صدی میں دو کتابیں سنسکرت زبان میں مرتب ہوئیں۔ ایک کا نام بتیال پچیسی (یعنی بتیال کے متعلق ۲۵ کہانیاں) تھا۔ دوسری کو اسی کا ضمیمہ سمجھنا چاہئے۔ اس کا نام سنگھاسن بتیسی ہے (تخت کے متعلق ۳۲ حکایات) ان کتابوں کا ترجمہ تقریباً ہندوستان کی تمام زبانوں میں ہوچکا ہے۔ سر رچرڈ برٹن نے بتیال پچیسی میں سے گیارہ کہانیوں کا ترجمہ Vikrama & The Vampire کے نام سے انگریزی میں کیا۔ اور The Tales of King Vikrama نے تمام کتاب کو A. Kincaid. C.V.O. کے نام سے انگریزی میں منتقل کرلیا (مطبوعہ اوکسفورڈ یونیورسٹی پریس بمبئی)

میرے خیال میں سنگھاسن بتیسی اب تک انگریزی زبان میں منتقل ہوکر ارباب ذوق کے ہاتھوں میں نہیں پہنچی تھی۔ لیکن اب یہ پوری کتاب انگریزی میں موجود ہے۔ معلوم نہیں ہماری اردو نے بھی پچھلی پانچ صدی کی اس یادگار سے کچھ حاصل کیا یا نہیں۔

ضمیمہ اس قدر دلچسپ نہیں ہے جس قدر اصل کتاب ہے۔ ان دلچسپ کہانیوں میں سے ہم فی الحال دو کا ترجمہ پیش کرتے ہیں۔

بتیال پچیسی کا ہیرو راجہ وکرما یا وکرماجیت ہے جو ہندوؤں میں اوتار مانا گیا ہے۔ اس کا کیرکٹر انگریزی تاریخ میں انگلستان کے شاہ آرتھر سے کسی قدر ملتا جلتا ہے۔ سنگھاسن کا ہیرو زیادہ پرانے زمانہ کا انسان نہیں ہے مالوے کا راجہ بھوج اس کہانی کا ہیرو ہے۔ قصہ کا آغاز یوں ہوتا ہے:۔

راجہ بھوج دھرم نگر یا اُجین کا حکمراں تھا۔ اُس کے عہد میں ایک برہمن نے اونتی قصبہ کے پاس ایک قطعۂ اراضی زراعت کے لئے خریدا۔ کھیت کے وسط میں اس نے ایک چبوترا سا چھوڑ دیا تھا۔ جہاں سے وہ جانوروں کو بھگایا کرتا تھا۔ چند روز بعد وہ اس چبوترے میں ایک عجیب وغریب بات محسوس کرنے لگا۔ جب وہ اس پر بیٹھتا تو اُس کے خیالات بے انتہا بلند و وسیع ہوجاتے۔ اُس کے اخلاق اور اُس کی ذہنیت پر ایسا عجیب اثر طاری ہونے لگا کہ وہ عام سطحِ انسانی سے دفعتہً بہت بلند ہوجاتا۔ رموزِ حیات کا انکشاف، آئینِ حکومت کی باریکیاں اور تصوف کے اسرارِ نہفتہ براگندہ نقاب ہوجاتے اور وہ محسوس کرنے لگتا کہ تمام دنیا اس کے زیر نگیں ہے۔ لیکن جب اس

چبوترے پر سے اتر جاتا تو پھر وہی ایک پست ہمت برہمن تھا اور وہی اس کے گداگری کے خیالات!

آخر ایک روز اُس نے جرأت کر کے راجہ بھوج سے اس تمام واقعے کو بیان کیا۔ وہ بھی سن کر سخت متعجب ہُوا اور بکمال اشتیاق اس سحر بند چبوترہ کی آزمائش کے لئے اس کے ساتھ ہو لیا۔ جونہی راجہ نے اس پر قدم رکھا۔ معاً اس پر ایک کیفیت سی طاری ہوئی اور اس کے دماغ میں بھی بلند ترین خیالات، اور مدبّرانہ باتیں وارد ہونی شروع ہوئیں۔ اُس نے اس راز کو معلوم کرنا چاہا۔ چنانچہ زر کثیر دے کر کھیت برہمن سے خرید لیا اور چبوترے کو کھدوانا شروع کیا۔ آخر کار ایک تختِ زرنگار برآمد ہُوا جس کے چاروں طرف طلائی مورتیاں آویزاں تھیں۔ راجہ اس کو اپنے محل میں لے گیا۔ اشنان کیا اور دیوتاؤں کی پوجا پاٹ کر کے تخت پر متمکن ہُوا۔ دفعتہً "جادہ" دیوتا کی چھوٹی سی مورتی جو تخت میں آویزاں تھی راجہ سے بولی "راجہ بھوج یہ تخت صرف درویش صفت لوگوں کے لئے ہے۔ عام لوگوں کو اس پر بیٹھنا نہیں چاہئے"۔ راجہ متحیر ہو کر بولا۔ میں ہر سال ہزاروں روپے خیرات کرتا ہوں۔ میرے برابر کوئی کیا دیالو اور دان کرنے والا ہو سکتا ہے"۔ جادہ نے جواب دیا برخود غلط لوگ اسی طرح اپنی تعریف اپنے منہ سے کیا کرتے ہیں۔ دوسروں کی تعریف کرنا گناہ نہیں لیکن خودستائی پاپ ہے جس کا پھل اندر پاچ کا ہے"۔ راجہ بھوج شرمندہ ہُوا اور مؤدبانہ خواستگارِ عفو ہو کر بولا "اس متبرک تخت کا وارث کون درویش صفت شخص تھا؟"

مورتی نے اس طرح حکایت بیان کرنی شروع کی:-

جس زمانہ میں راجہ بھرتری اوجین میں حکومت کرتا تھا ایک برہمن نے پروتی دیوی کی تپشا کر کے اس کو بہت خوش کر لیا تھا۔ اس نے ایک روز بکمالِ خوشنودی برہمن سے کہا کہ کوئی انعام طلب کرے۔ برہمن نے اس سے استدعا کی کہ اس کو حیاتِ ابدی بخش دی جائے۔ دیوی نے اس کو ایک سیب عطا کیا اور کہا کہ اس کو کھانے سے تم ابدالآباد تک زندہ رہو گے"۔ برہمن نے سیب لے لیا اور مکان پر جا کر سوچنے لگا کہ اگر سیب کھا کر اُس نے حیاتِ ابدی حاصل کر لی تو اس کو مدت العمر تک بھیک مانگتے ہی گذارہ کرنا پڑے گا۔ بہتر ہے کہ سیب راجہ کو دے دوں۔ ممکن ہے کہ وہ خوش ہو کر اس کے صلہ میں مجھ کو نہال کر دے۔ یہ سوچ کر وہ راجہ بھرتری کے دربار میں پہنچا اور سیب کی خاصیّت بیان کی۔ راجہ بہت خوش ہُوا اور خوب انعام و اکرام دے کر وہ سیب اس سے لے لیا۔

وہ سیب راجہ نے اپنی چہیتی بیوی کو دے دیا۔ لیکن بیوی نے خود نہیں کھایا بلکہ اپنے ایک اور عاشق کو دے دیا۔ اس عاشق نے ایک اور کسبی کو دے دیا۔ اس طرح سیب کہیں سے کہیں پہنچ گیا۔ یہ کسبی راجہ کی بہی خواہ تھی چنانچہ اس نے ایک روز حاضرِ خدمت ہو کر وہ سیب راجہ کے نذر کر دیا۔ بھرتری کو جب تمام واقعات کا علم ہوا تو اس کو دنیا و مکائدِ دنیا سے سخت نفرت ہو گئی۔ اس نے حکومت سے دست کشی اختیار کر لی اور سیب کھا کر

عبادت کے لئے صحرا و بیابان میں نکل گیا۔

لوگوں نے ایک اور شخص کو تخت نشین کر دیا۔ مگر اس کو شیطان نے مار ڈالا۔ اس کے بعد دوسرا آدمی سریر آرائے مملکت ہوا لیکن اس کا بھی وہی حشر ہوا۔ اسی طرح یکے بعد دیگرے بہت سے لوگ گدی پر بیٹھے اور سب مارے گئے حتیٰ کہ شاہی نسل سے کوئی متنفس باقی نہ رہا۔ صرف بھرتری کا سب سے چھوٹا بھائی وکرما رہ گیا تھا جب اُس نے تمام واقعات سُنے تو عام حیثیت کے انسان کی طرح اوجین میں وارد ہوا اور تخت نشینی کی آرزو ظاہر کی۔ تمام لوگ اُس کی اس تمنائے مرگ پر متعجب ہوئے اور اس کو سمجھانے لگے لیکن اُس پر کچھ اثر نہ ہوا بالآخر انہوں نے اُس کو بادشاہ بنا لیا۔

وکرما دن بھر شاہی فرائض انجام دیتا اور شب کو کھانا بستر کے قریب رکھ کر شمشیر بکف تخت کی نگرانی کرتا۔ اس طرح وہ بہت دنوں تک حکومت کرتا رہا۔

پھر یہاں سے دوسری کہانی چھڑ جاتی ہے۔ اسی طرح افسانہ از افسانہ می خیزد والا مضمون جاری ہے اگر اس قسط کو پسند کیا گیا تو انشاء اللہ باقی اجزاء پھر کبھی فراہم کر کے پیش کر دیئے جائیں گے۔

قیسی

محبّت اور عزّت

یہ مانا اک زمانے سے مجھے تجھ سے محبّت ہے
یہ مانا تیرا نظّارہ مجھے سامانِ راحت ہے

یہ مانا میں نے پیارے ایسے جذباتِ پریشاں کی
تری صورت سے رونق دی ترے جلوے سے زینت ہے

یہ مانا مجھ کو ہی جنت بھی دوزخ ہجر میں تیرے
اگر تو ہو تو دوزخ بھی مری نظروں میں جنت ہے

یہ مانا میں غزل خواں ہوں تری تعریف میں ہر دم
یہ مانا مجھ کو خدمت سے تری دیرینہ نسبت ہے

مگر معلوم ہو تجھ کو کہ میں خوددار عاشق ہوں
مجھے تیری محبّت سے زیادہ اپنی عزّت ہے

جاذب دہلوی

نواہائے راز

کس روز مری موت کا ساماں نہیں ہوتا
کس دن وہ مری جان کا خواہاں نہیں ہوتا

روتے ترے بھولے ہوئے گلشن فانی
اس طرح کوئی آپ پہ خنداں نہیں ہوتا

ایمان میں شک، کفر میں شک وائے تذبذب
کافر ہی بنے دل جو مسلماں نہیں ہوتا

ایماں مجھے محبوب ہے مشکل ہے تو یہ ہے
ناصح مرا ایماں، ترا ایماں نہیں ہوتا

کس دل سے یہ کہتے ہو، مجھے بھول نہ جانا
بھولے ہو تمہیں، بھولنا آساں نہیں ہوتا

یاد

کلفت میں بھی بہانۂ راحت ہے تیری یاد
دوزخ میں بھی مرے لئے جنت ہے تیری یاد

پھر روتے روتے یاد ہنسی آ گئی تری
تاریک دل میں نورِ مسرت ہے تیری یاد

دونوں جہاں بھی کھو کے نہ بے مایہ میں ہوا
اے روحِ دو جہاں مری دولت ہے تیری یاد

دل سے فسانۂ غمِ عالم بھلا دیا!
سحرِ وفا، فسونِ محبت ہے تیری یاد

پایا تجھے تو غایتِ ہستی کو پا لیا
آئینِ دو جہاں سے فراغت ہے تیری یاد

مجھ سے الم نصیب پہ، اور یہ نوازشیں
مہر و وفا و لطف و مروت ہے تیری یاد

حامد علی خاں

محفلِ ادب

گیٹے

۱

اُس کی صدسالہ برسی

گیٹے جرمنی کا ایک مشہور فلسفی، مشہور شاعر، مشہور انشا پرداز اور مشہور ناولسٹ تھا اور اہلِ جرمنی نے موت و زندگی دونوں حالتوں میں اُس کی نہایت قدر کی۔ اب جب کہ اس کی وفات پر ایک پوری صدی گذر چکی ہے۔ اہلِ جرمنی نے اس کی صدسالہ برسی مناکر اپنی عام عقیدت و محبّت کا اظہار کیا ہے اور اس تقریب سے اپریل ۱۹۳۲ء کے مقتطف نے ایک طویل مضمون گیٹے کے سوانحِ زندگی پر شائع کیا ہے، جس کا خلاصہ ہم ناظرینِ معارف کی دلچسپی کے لئے درج کرتے ہیں، وہ لکھتا ہے:۔

گیٹے ۲۸ مارچ ۱۷۴۹ء کو شہر فرینکفرٹ میں پیدا ہوا، جو جرمنی کا ایک عظیم الشان تجارتی شہر ہے، اس کا باپ اگرچہ ایک دولتمند شخص تھا، تاہم وہ کسی شریف خاندان سے تعلق نہیں رکھتا تھا بلکہ اس کا دادا جولاہا تھا اور فرینکفرٹ میں اپنا پیشہ کرتا تھا، پھر بعد کو ایک ہوٹل کا مینجر بن گیا لیکن چونکہ وہ اپنی خاندانی پستی سے واقف تھا، اس لئے اُس نے اپنے بیٹے یعنی گیٹے کے باپ کو عمدہ تعلیم دلائی تاکہ خاندانی پستی کی تلافی علمی ذریعہ سے ہو جائے، چنانچہ اس نے تعلیم میں اس قدر ترقی کر لی کہ فرینکفرٹ کے متوسط طبقہ کے بہترین لوگوں میں اس کا شمار ہونے لگا، یہاں تک کہ اس نے ۱۷۴۸ء میں ایک شریف خاندان میں شادی کر لی، اور شادی کے بعد جو سب سے پہلا لڑکا پیدا ہوا وہ یہی گیٹے تھا۔

خوش قسمتی سے گیٹے نے تعلیم میں اپنے باپ سے زیادہ ترقی کر لی اور دولت مندی نے اس کی تعلیم کی راہ میں ہر قسم کی آسانیاں پیدا کیں چنانچہ اس نے بچپن کی خانگی تعلیم میں مختلف زبانیں مثلاً لیٹن، یونانی، انگریزی اور فرنچ سیکھ لیں زبان کے علاوہ علوم و فنون میں اس نے ریاضی، موسیقی اور تصویر کشی کی تعلیم بھی گھر ہی پر پائی، گو وہ ریاضی اور تصویر کشی میں کوئی امتیاز نہ کر سکا، تاہم تصویر کشی میں ایک متوسط درجہ کی مہارت پیدا کر لی، فرینکفرٹ میں بہت سے یہودی بھی رہتے تھے جن کی زبان جرمن اور عبرانی زبان سے مخلوط تھی، اس تعلق سے گیٹے نے عبرانی زبان سیکھ لی اور اس میں اس قدر مہارت بہم پہنچائی، کہ توراۃ کو اس کی اصلی زبان میں پڑھ سکتا تھا، جرمن قوم کی ایک عام اخلاقی خصوصیت صبر و استقلال و تفرد

توجہ ہے اور اسی اخلاقی خصوصیت نے جرمنوں میں اسپشلسٹ یعنی کسی علمی یا عملی شعبے میں خصوصی بننے کی قابلیت اور قوموں سے زیادہ پیدا کر دی ہے۔ لیکن گیٹے میں اس کے بخلاف تلون مزاجی پائی جاتی تھی۔ اس لئے وہ مستقلاً کسی ایک موضوع ایک علم اور ایک شعبے پر قناعت نہیں کر سکتا تھا، بلکہ اس کا دماغ علم و فن کے ہر دائرے میں چکر لگاتا رہتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے ابتدا ہی سے مختلف موضوع کو اپنا جولانگاہ بنایا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اگر وہ صرف شعر یا ادب پر اکتفا کرتا تو اس سے زیادہ کمال پیدا کرتا جتنا اس نے اس علمی دشت گردی میں پیدا کیا۔ بہر حال گھر کی تعلیم سے فارغ ہو کر وہ اکتوبر ۱۷۶۵ء میں سولہ سال کی عمر میں لیپزگ کی یونیورسٹی میں داخل ہوا۔ گیٹے کے والد نے قانون کی تعلیم حاصل کی تھی، اس لئے اس کی خواہش یہ تھی کہ اس کا بیٹا بھی سب سے پہلے قانون ہی کی تعلیم حاصل کرے لیکن گیٹے بالطبع علم ادب کا شائق تھا اور اس نے قانون کے پروفیسر سے اپنے اس ذوق کا اظہار کیا تو اس نے کہا کہ "ادب ایک سطحی علم ہے، عمیق النظر طلبہ اس کی طرف توجہ نہیں کرتے"۔ اس بنا پر اس نے کچھ دنوں قانونی لکچروں میں شرکت کی، لیکن بعد کو دل برداشتہ ہو کر قانون کی تعلیم کو چھوڑ دیا۔ اس نے اپنی کتاب فاؤسٹ میں طالب العلم اور ابلیس کا جو مکالمہ لکھا ہے، وہ غالباً انہی طالب العلمانہ تجربات کا نتیجہ ہے۔ بہر حال وہ قانون کو چھوڑ کر اپنے ذوق کے مطابق دوسرے علوم کی تکمیل میں مشغول ہوا۔ اور علم ادب کے ساتھ تاریخ طبعی اور علم طب سے بھی دلچسپی پیدا کی لیکن اس نے لیپزگ یونیورسٹی میں اپنی زندگی کا بہت کم حصہ بسر کیا، وہ اپنے اوقات زیادہ تر فنون لطیفہ کے معابد میں صرف کرتا تھا، اور جس کے ہوٹل میں کھانا کھاتا تھا اس کی لڑکی کے وصف میں عاشقانہ اشعار کہتا تھا، اسی زمانے میں اس نے دو ناول "مزاج عشاق" (DIE LAUNE DES VERLIEBTEN) اور "شریک کار جرم" (DIE MITSCHULDIGEN) لکھے اور گیٹے کی تصنیفات میں سب سے قدیم تصنیف یہی دونوں ہیں، اس کے پہلے اس نے جو کچھ لکھا تھا وہ ضائع ہو گیا، بلکہ اس کا زیادہ تر حصہ اس نے خود جلا ڈالا۔

لیپزگ میں تین سال بسر کرنے کے بعد وہ ۱۷۶۸ء میں سخت بیمار ہو کر فرینکفورٹ واپس آیا اور ۱۷۷۰ء کی ابتدا میں کامل شفا پائی۔ اب اس کے باپ نے اس کے غیر مطبوع موضوع یعنی قانون کی تعلیم کے لئے پھر بھیجنا چاہا اور اپریل ۱۷۷۰ء میں اس کو اسٹراسبرگ کی یونیورسٹی میں بھیجا یہاں اس نے قانون کی تعلیم تو جبراً حاصل کی، لیکن اپنے وقت کا بڑا حصہ تشریح، علم النباتات، کیمیا اور علم ادب کی تحصیل میں صرف کرتا رہا، غرض اس کی تعلیم کا زمانہ اس طرح گذرا کہ اس نے کبھی ایک علم پر قناعت نہیں کی، بلکہ ہمیشہ زبان کا ذائقہ بدلتا رہا۔

اسٹراسبرگ کا تعلیمی زمانہ گیٹے کے سوانح حیات میں خاص طور پر اہمیت رکھتا ہے، اسی زمانہ میں اس نے قانون میں ڈاکٹری کی سند حاصل کر کے اپنے باپ کی آنکھیں ٹھنڈی کیں اور اسی یونیورسٹی میں وہ ہرڈر (HERDER) سے ملا، اور اس سے مستفید ہوتا رہا۔ ہرڈر نے اصول علم ادب میں بہت سی کتابیں لکھی تھیں، اور وہ گیٹے کو اپنی خاص

تعلیمات سے متاثر کرتا رہا جس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ گیٹے کی توجہ ہومر اور شکسپیر وغیرہ کی طرح قومی شعر و ادب کی طرف مبذول ہو گئی اور اس نے جرمنی کی تاریخ میں جرمن رُوح اور ٹیوٹن قوم کی میتھالوجی کی جستجو شروع کردی اور ان کوششوں کا نتیجہ یہ ہُوا کہ جرمنی میں ایک نیا ادبی دور شروع ہوگیا جو ان تمام قیود سے آزاد تھا جو ادبِ قدیم ذوقِ قدیم کے ذوق و شغف نے عائد کردی تھیں۔

اس جدید تحریک کا نام (STURM UND DRANG) ہے جس کا ترجمہ تو مشکل ہے، البتہ لفظ "شورش و اضطراب" سے کسی قدر یہ مفہوم ادا ہوسکتا ہے۔ گیٹے کے مشہور ڈراما "گوٹز" (GOTZ) میں اسی روح کی جلوہ گری پائی جاتی ہے۔

اسٹراسبرگ کے قریب ہی ایک گاؤں میں ایک پادری رہتا تھا، اور اسی سلسلہ میں اس سے گیٹے کی شناسائی ہو گئی اور آمد و رفت کا سلسلہ جاری ہوگیا، رفتہ رفتہ وہ اس کی لڑکی پر فریفتہ ہوگیا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ عقد کے متعلق غور و فکر ہونے لگا لیکن پھر گیٹے نے اس کو اپنی آئندہ زندگی کے اعمالِ جلیلہ کے لئے ایک بڑی سمجھا، اس لئے اُس نے اس تخیل سے کنارہ کشی اختیار کرلی، اور اگست ۱۷۷۱ء میں ڈاکٹر اور وکیل بن کر فرینکفورٹ واپس آیا۔ اور وطن میں واپس آنے کے بعد اس نے اپنا مشہور ناول "گوٹ" لکھنا شروع کیا جو ۱۷۷۳ء میں شائع ہُوا لیکن اس کے شائع ہونے سے ایک سال پہلے گیٹے وتسلار میں جہاں ہائیکورٹ تھا قانونی مشاغل کی مہارت بہم پہنچانے کے لئے چلا گیا اور وہاں جاکر شرلوٹ بوف پر جو کیسنر کی منگیتر تھی، فریفتہ ہوگیا اور چند مہینوں کے بعد فرینکفورٹ میں واپس آکر اس عشق کا نتیجہ ایک کتاب کی صورت میں ظاہر ہُوا جس کا نام "آلام ورتر" تھا، یہ کتاب اگرچہ جرمن علم ادب میں کوئی بلند پایہ کتاب نہ تھی تاہم اس سے گیٹے کی شہرت میں خاص اضافہ ہُوا اور اس کا اثر اس کی آئندہ زندگی پر پڑا، اس کتاب کے شائع ہونے کے چند دنوں کے بعد وہ فرینکفورٹ میں پھر ایک دولتمند شخص کی لڑکی پر فریفتہ ہوا جس کا نام "انا شونمان" تھا، اس کا نام اس نے لیلی رکھا، اور اس سے قانونی عقد بھی کرلیا، لیکن وہ اُس کو قائم نہ رکھ سکا، اور چند دنوں کے بعد فسخ کردیا، ۱۷۷۵ء میں جب کہ اُس کا سن ۲۶ سال کا تھا اور اپنے اشعار اور تصنیفات کی بدولت جرمنی بلکہ تمام یورپ میں کافی شہرت حاصل کرچکا تھا۔ اس کی ملاقات کارل اوگسٹ ڈیوک ویمر سے کارلسر میں ہوئی جس نے اس کو سیر ویمر کی دعوت دی، پہلی ملاقات تھی۔ اس کے بعد یہ ڈیوک خود فرانکفورٹ میں آیا، اور گیٹے سے دوبارہ ملاقات کی، اور ویمر آنے پر سخت اصرار کیا، گیٹے کا باپ اگرچہ امرا کے تعلقات کا مخالف تھا۔ تاہم مجبوراً چند ہفتے کی اجازت دی لیکن یہ کیا معلوم تھا کہ یہ مقام گیٹے کا دوسرا وطن ہوجائے گا۔ اور اس کی قبر کا گنبد یہیں بنے گا۔

اس وقت جرمنی کی حکومت جن مختلف حصوں میں منقسم تھی ویمر اس کا ایک چھوٹا سا حصہ تھا، اس کے باشندوں کی تعداد بہت کم تھی جو تمام تر زراعت پیشہ تھی، اس حصہ کی آمدنی بھی اگرچہ بہت کم تھی، تاہم اس کے رئیس کی قدردانی

سے وہ علما و فضلا کا ٹھکانا بن گیا تھا، اور اس حیثیت سے بوٹسڈم کے سوا اس کا کوئی دوسرا حریف نہ تھا، البتہ دونوں میں یہ فرق تھا کہ فریڈرک اعظم صرف لیٹن علم وفن کی قدر دانی کرتا تھا اور فرانسیسی زبان کا شیدائی تھا، لیکن اس کے بخلاف ویمر کے تمام باشندے جرمن تھے اور وہاں صرف جرمن علوم وفنون کی فرمانروائی تھی اور اس لحاظ سے جرمن علم ادب پر اس کا خوشگوار و پائدار اثر پڑتا تھا۔

ویمر اپنے مناظر طبعی کے لحاظ سے بھی ایک عمدہ مقام تھا، اس لئے گیٹے اپنے دوست ڈیوک کے ساتھ سیر و تفریح کے بھی لطف اٹھاتا تھا علمی گفتگو بھی کرتا تھا، اور ویمر کے سیاسی معاملات پر بھی بحث ہوتی تھی۔ دونوں میں سخت بے تکلفی تھی اور کاشت کاروں اور مزدوروں سے ملتے جلتے رہتے تھے، یہاں تک کہ رات رات بھر مزدوروں کی لڑکیوں کے ساتھ رقص و سرود میں مصروف رہتے تھے، اگرچہ اس زندگی نے ان کے اصلی مشاغل پر کوئی اثر نہ ڈالا تاہم ویمر کے ابتدائی سالوں میں گیٹے کسی قابل ذکر مصنف کی حیثیت سے نمایاں نہ ہو سکا ڈیوک ویمر نے گیٹے کو بمشاہرہ ۲۰۰ ڈالر ایک سرکاری عہدے پر بھی سرفراز کیا جو ویمر میں ایک معزز عہدہ خیال کیا جاتا تھا لیکن ڈیوک کا یہ تقرب اور دفعتہً اتنے بڑے عہدے پر یہ تقرر قدیم ملازمین کے لئے باعث رشک ہوا اور ان لوگوں نے یہ شکایت کی کہ نیچے کے درجوں سے ترقی کئے بغیر وہ اس عہدے کا مستحق نہیں ہو سکتا، اس لئے جو لوگ اس کے مستحق تھے، ان کی حق تلفی ہوگی لیکن ڈیوک نے گیٹے کی قابلیت کی بنا پر اس کو اس عہدے کا سب سے زیادہ مستحق قرار دیا۔

اب اس تعلق سے ڈیوک اور گیٹے کے دوستانہ تعلقات اور بڑھ گئے اور بڑے بڑے انتظامی معاملات اس کے متعلق کئے گئے، ڈیوک نے گیٹے کو مستقل قیام کے لئے نہر آلم پر ایک چھوٹا سا خوشنما گھر بھی عنایت کیا، اور گیٹے نے ویمر میں قیام کر کے مستقل دس برس تک نہایت اہم اصلاحی اور سیاسی خدمتیں انجام دیں۔ ادبی اور علمی خدمات کا سلسلہ اس سے الگ تھا، اور ایک تجربہ کار لیڈی شارلوٹ فان شتائن کی محبت کے رشتہ دراز کا سلسلہ اس پر مستزاد تھا، ان تمام اعمال شاقہ کو دیکھ کر ڈیوک کی خواہش تھی کہ گیٹے تھوڑا سا وقت آرام کے لئے بھی نکالے لیکن گیٹے نے ۱۷۸۶ء سے پہلے کبھی آرام و اطمینان کی طرف رخ نہیں کیا، البتہ اس سن میں جب اس نے اٹلی کا سفر کیا اور مستقل بیس مہینے کی سیاحت میں اس کو رومن قوم کی تہذیب کے عظیم الشان آثار نظر آئے تو ویمر کے سیاسی اور انتظامی امور کے انصرام سے وہ دل برداشتہ ہو گیا۔ علمی و ادبی خدمت کے انجام دینے کا شوق بہت زیادہ بڑھ گیا چنانچہ اس نے اٹلی سے ڈیوک کی خدمت میں استعفا بھیج دیا اور ڈیوک نے دوستانہ تعلقات کی بنا پر اس کو منظور کر لیا۔ البتہ گیٹے نے خود اپنی خواہش سے ان علمی اور فنی خدمات کو اپنے ہاتھ میں رکھا جو تھیٹر سے تعلق رکھتی تھیں۔ اس کے بعد گیٹے ۱۷۸۸ء میں ویمر واپس آیا تو بالکل بدلا ہوا تھا، میڈم فان شتائن نے بھی اس کی خشک مزاجی کو محسوس کیا اور رفتہ رفتہ دونوں کے عاشقانہ تعلقات منقطع ہو گئے، لیکن یہ طوق اس کے گلے سے جدا نہ ہوا بلکہ ۱۷۸۸ء میں ویمر کے ایک باغ میں اس کو ایک نوخیز لڑکی ملی، جس کا نام کرسٹیان تھا، یہ لڑکی اگرچہ ادنیٰ درجہ سے تعلق

رکھتی تھی اور تعلیم میں بھی اُس کا درجہ بلند نہ تھا، تاہم گیٹے اُس کے حسن وجمال اور لطافتِ اخلاق پر فریفتہ ہوگیا، اور اس قدر تعلقات بڑھائے کہ اس سے شادی کرلی، تاہم چونکہ دونوں کے درجہ وحیثیت میں نمایاں فرق تھا اس لئے گیٹے پر سخت ملامتوں کی بوچھاڑ کی گئی۔ وہ اگرچہ رسم ورواج کا پابند نہ تھا، تاہم ان اعتراضات کا اس پر یہ اثر ضرور پڑا کہ وہ قانوناً اس کے نکاح کا اعلان نہ کرسکا، بہرحال گیٹے نے اس کی صحبت میں مدتوں خوشگوار زندگی بسر کی، اور اس کی اعانت سے اپنی بہترین نظم "منظومات رومانیہ" کو لکھ سکا اور علمی تحقیقات اور بصریات وریاضیات وغیرہ میں دیوانہ وار مصروف رہنے لگا، لیکن اس کے بعد یورپ کی سیاسی فضا میں سخت ہیجان پیدا ہوا اور شاہی حقوق کے خلاف فرانس میں شورش برپا ہوئی۔ اور اس کے مقابلہ میں تمام سلاطینِ یورپ نے باہم اتحاد کرکے شاہی حقوق کی حفاظت کے لئے جنگی تیاریاں کیں، گیٹے اگرچہ ان میں کسی کا حامی نہ تھا تاہم شہنشاہ پرشیا بھی اس اتحاد میں شامل تھا۔ اور اس تعلق سے اس نے ڈیوک ویمر کو ایک فوج کا سپہ سالار بنایا، اس لئے گیٹے کو بھی اس کی رفاقت کرنی پڑی۔ تاہم اس حالت میں بھی وہ اپنا وقت تمامتر علمی کاموں میں صرف کرتا تھا، یہاں تک کہ جب اتحادیوں کو شکست ہوئی تو وہ اس لئے خوش ہوا کہ اب وہ ان مشاغل کو اور بھی زیادہ دلجمعی سے انجام دے سکے گا،

اس کے بعد گیٹے ۱۷۹۲ء کے اخیر میں ویمر واپس آیا اور دوسرے سال کے مئی میں انجمن تاریخ طبعی کے ایک لکچر کے سلسلے میں شلر سے ملا اور اس وقت سے دونوں میں دوستانہ تعلقات پیدا ہوئے جو بعد کو اتنے بڑھے کہ دنیا کی ادبی تاریخ میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔

بڑھاپے میں یورپ کے تمام جھگڑوں سے الگ ہو کر گیٹے نے ایک دوسری قسم کی شاعرانہ وادیبانہ زندگی اختیار کی یعنی مشرقی علم ادب کی طرف متوجہ ہوا اور اس سلسلے میں ایک طرف اس کے ہاتھ میں حافظ کا دیوان اور دوسرے میں قرآن تھا، وہ ان دونوں سے نہایت شغف رکھتا تھا، اگر وہ براہِ راست عربی اور فارسی زبان سے واقف ہوتا اور ان کے ترجموں سے کام نہ لیتا تو وہ ان سے اور بھی زیادہ متاثر ہوتا۔ بہرحال اس تاثر کا نتیجہ ایک نادر کتاب "دیوان الشرق والغرب" کی صورت میں ظاہر ہوا، جس میں اس نے مشرق کی بہت سی تصویریں کھینچیں اور ان اشعار کی شرح میں مشرق کے بہت سے تاریخی حالات بھی لکھے، گیٹے نے طویل عمر پاکر ۲۲ مارچ ۱۸۳۲ء کو ویمر میں وفات پائی اور اپنے دوست شلر کے پہلو میں دفن ہوا۔

"معارف"

مطبوعات

مسلم ریوائیول (*The Muslim Revival*) یہ سہ ماہی انگریزی رسالہ مولوی محمد علی صاحب امیر جماعت احمدیہ کے زیر نگرانی لاہور سے جاری ہوا ہے۔ اس کا پہلا پرچہ مارچ ۱۹۳۲ء میں شائع ہوا جو اس وقت ہمارے زیر نظر ہے۔ سرسری نگاہ سے معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ رسالہ ایک بہت بڑی ضرورت کو پورا کرتا ہے۔ پہلے پرچے میں "اسلامی تہذیب اور بنگالی مسلمان" ایک بصیرت افروز انتہاہی مضمون ہے جس کی طرف ہندوستانی مسلمانوں کو خاص توجہ کرنی چاہئے۔

لالہ رام چند منچندہ وکیل ہائی کورٹ لاہور نے "ہندوستانی تہذیب پر مغلوں کا اثر" کے عنوان سے ایک دلچسپ مضمون لکھا ہے۔ "بابی تحریک" کے متعلق مولانا محمد علی کا مضمون نہایت محققانہ ہے۔ دوسرے مضامین اور نوٹ وغیرہ بھی اچھے ہیں۔ رسالہ کی ترتیب قابل تعریف ہے۔ اور اگر ظاہری و باطنی محاسن کا یہ معیار قائم رہا تو یہ رسالہ قابل قدر ہوگا۔ رسالے میں تصاویر بھی ہیں۔ حجم ۹۶ صفحات چندہ سالانہ پانچ روپے۔ قیمت فی پرچہ عہ۔ دفتر مسلم ریوائیول لاہور سے طلب کیجئے۔

انتخاب حسرت۔ یہ مولانا حسرت موہانی کے کلام کا انتخاب ہے۔ چھوٹی تقطیع کے ۱۳۲ صفحات ہیں۔ جناب جلیل احمد صاحب قدوائی بی اے علیگ نے سلیقہ سے دیباچہ لکھا ہے۔ حسرت کا کلام یا اس کا کوئی انتخاب تنقید کا محتاج نہیں۔ حسرت کی شاعری اہل حال کے دلوں سے خراج تحسین وصول کر چکی ہے۔ یہ عشق و محبت کے سوز میں ڈوبا ہوا کلام دیکھ کر کسی نے خوب کہا کہ "حسرت کے پہلو میں دل کی جگہ تھوڑی سی راکھ ہوگی"۔

یاد یاد ہیں سارے وہ عیشِ بافراغت کے مزے — دل ابھی بھولا نہیں آغازِ الفت کے مزے
حسن سے اپنے وہ غافل تھا میں اپنے عشق سے — اب کہاں سے لاؤں وہ ناواقفیت کے مزے
صحتیں لاکھوں مری بیماریٔ غم پر نثار — جس میں اُٹھے بارہا اُن کی عیادت کے مزے

استغنا کہنا ہے انہیں یہ کہ نہ ہم ہوں گے مخاطب — پر کہتے نہیں زلف بنانے میں لگے ہیں

محرومیٔ غم آرزو کا حسرت سبب اور کیا بتاؤں — مری ہمتوں کی پستی مرے شوق کی بلندی

آغازِ عشق آہ اُس نگاہِ مست کی شوخی کہ بے خبر — خوبی پہ روئے یار کی پہلے پہل گئی

معاملہ بزمِ اغیار میں ہر چند وہ بیگانہ رہے — ہاتھ آہستہ مرا پھر بھی دبا کر چھوڑا

حجاب۔ مجھ سے وہ کھلیں کیا کہ نظر اُٹھ نہیں سکتی مجبوب ہیں پیمائشِ داماں میں لگے ہیں
حجم ۱۳۲ صفحات چھوٹی تقطیع قیمت ۱۲ آنے۔ مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی سے طلب کیجئے۔

عصمتی کشیدہ۔ یہ کتاب محترمہ آمنہ نازلی صاحبہ نے مرتب کی ہے۔ اس میں کشیدہ کاری کے تقریباً ڈیڑھ سو خوبصورت نمونے ہیں۔ قیمت عہ۔ ناشر دفتر عصمت دہلی۔

سرگزشت وزیر خاں لنکراں۔ جدید فارسی ڈراما۔ از مرزا جعفر قراجہ داغی۔ اس میں طالب علموں کی مدد کے لئے مولانا محمد عبد القوی فانی ایم۔ اے کا مقدمہ، اردو ترجمہ اور فرہنگِ لغات جدیدہ شامل ہے۔ قیمت عہ علاوہ محصول۔ ناشر آسی پریس محمود نگر لکھنؤ۔

عصمتی کروشیا۔ محترمہ فاطمہ بیگم صاحبہ نے کروشیا کے متعلق یہ کتاب بہت اچھی لکھی ہے۔ حجم ۱۲۰ صفحات اس میں کروشیا کے بہت سے نفیس نمونے ہیں۔ قیمت عہ۔ ناشر دفتر عصمت دہلی۔

مسدّس عاقل۔ مصنفہ محمد وزیر الدین صاحب عاقل اورنگ آبادی حجم ۴۳ صفحات قیمت ۴ر ناشر مکتبۂ ابراہیمیہ متصل امپیریل پوسٹ آفس حیدر آباد دکن

اسلامی نظامِ تعلیم۔ مصنفہ ڈاکٹر دانیل ہنیرگ مترجمہ حضرت درّانی۔ اس کتاب میں فاضل مستشرق نے اسلامی نظامِ تعلیم اور اسلامی مدارس کے طریقۂ تعلیم پر مبصرانہ بحث کی ہے۔ ترجمہ اچھا ہے۔ قیمت ۶ر ناشر قومی کتب خانہ ریلوے روڈ لاہور۔

تحریر النسا۔ مصنفہ محترمہ صغرا ہمایوں مرزا صاحبہ۔ مستورات کو خط و کتابت سکھانے کے لئے یہ کتاب لکھی گئی ہے۔ ہر خط میں نصیحت آموز اور کام کی باتیں درج ہیں۔ یہ کتاب بچیوں کے لئے مفید ہے قیمت ۱۲ر حجم ۱۲۰ صفحات ناشر دفتر عصمت دہلی۔

ہمارے رسول۔ سیرت کے متعلق خواجہ محمد عبد الحی فاروقی کی یہ مختصر سی تصنیف بہت مقبول ہو چکی ہے ہمارے زیر نظر دوسرا ایڈیشن ہے۔ یہ کتاب میسور اور بعض دوسرے مقامات کے نصابِ تعلیم میں داخل ہے حجم ۸۰ صفحات قیمت ۶ر ناشر مکتبۂ جامعہ ملیہ دہلی

بچوں کی تربیت۔ بچوں کی جسمانی اور اخلاقی تربیت کے لئے مولوی عبد الغفار صاحب الجبری دہلوی نے لکھی ہے۔ حجم ۱۰۰ صفحات سے زیادہ قیمت ۱۰ آنے۔ ناشر عصمت بک ایجنسی دہلی۔

قواعد مضمون نویسی حصّہ اول و دوم۔ قواعدِ زبان اور مضمون نویسی کے متعلق مفید ہدایات درج ہیں قیمت ہر دو حصص ۱۱ر ناشر مولوی محمد مظفر الدین صاحب مدرس مدرسۂ تحتانیہ قصبہ مانوت تعلقہ پاتھری۔

خاکِ شفا مع آبِ بقا اسلامی تاریخی نظم ہے قیمت ۳ر مصنف حافظ محمد یوسف علیخاں معرفت ہیرالال پریس جے پور

ہندوستان کے مشہور رسالہ نیرنگ خیال کا رعایتی اعلان
آٹھ سال کے بعد پہلا موقعہ
نیرنگ خیال ملک کا بہترین اور ارزاں ترین رسالہ ہے جو ہر ماہ باقاعدہ خریدار کو بھیجا جاتا ہے سال بھر میں قریباً .. وصفحات کے مضامین اور ایک سو کے قریب تصویریں ہوجاتی ہیں آج نیرنگ خیال ہر گھر میں موجود ہے اور اس کے مضامین کی دہوم مچی ہوئی ہے باوجود ان خوبیوں کے سالانہ چندہ صرف تین روپے چھ آنہ ہے۔
جن لوگوں کے ہاتھوں میں ابھی تک نیرنگ خیال نہیں پہونچا ان تک پہونچانے کے لئے ہمنے ایک رعایتی اعلان کی تجویز کی ہے تاکہ وہ مستفید ہوسکیں ؛
(۱) جو طالب علم صرف تین روپے منی آرڈر کر دیں اور کوپن پر اپنے استاد سے دستخط کرائیں ان کے نام رسالہ سال بھر تک جاری رہیگا ؛
(۲) مثر نیرنگ خیال کے مشہور ہفتہ وار اخبار تازیانہ ریویو کا علاج ہوتا ہے اس کا سالانہ چندہ تین روپے ہے لیکن نیرنگ خیال اور تازیانہ ریویو کے کل سات روپے چھ آنے کی جگہ صرف ۵ روپے لئے جائیں گے اس طرح آپ کو بہترین ہفتہ وار اخبار اور بہترین ماہوار رسالہ اس قلیل چندہ میں ملیگا۔ رقم منی آرڈر کے ذریعہ سے آنی چاہیئے ورنہ وی پی پر پانچ آنے زائد لگیں گے ؛
مینیجر رسالہ نیرنگ خیال و تازیانہ ریویو شاہی محلہ لاہور

محمد سعید صدیقی خوشنویس رسالہ ہمایوں ۲۶ فلیمنگ روڈ۔ لاہور

قواعد

۱۔ "ہمایوں" بالعموم ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔

۲۔ علمی و ادبی، تمدنی و اخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ معیارِ ادب پر پورے اتریں درج کئے جاتے ہیں۔

۳۔ دل آزار تنقیدیں اور دل شکن مذہبی مضامین درج نہیں ہوتے۔

۴۔ ناپسندیدہ مضمون ایک آنہ کا ٹکٹ آنے پر واپس بھیجا جا سکتا ہے۔

۵۔ خلافِ تہذیب اشتہارات شائع نہیں کئے جاتے۔

۶۔ ہمایوں کی ضخامت کم از کم چونسٹھ صفحے ماہوار اور آٹھ سو صفحے سالانہ ہوتی ہے۔

۷۔ رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع دفتر میں ہر ماہ کی ۱۰ تاریخ کے بعد اور ۱۷ سے پہلے پہنچ جانی چاہیئے اس کے بعد شکایت لکھنے والوں کو رسالہ قیمتہً بھیجا جائے گا۔

۸۔ جواب طلب امور کے لئے ار کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ آنا چاہیئے۔

۹۔ قیمت سالانہ چار روپے، ششماہی دو روپے ۱۲ر (علاوہ محصول ڈاک) فی پرچہ ۶ر۔

۱۰۔ منی آرڈر کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتہ تحریر کیجئے۔

۱۱۔ خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر جو لفافہ پر پتہ کے اوپر درج ہوتا ہے ضرور لکھئے۔

مینیجر رسالہ ہمایوں

۲۳۔ لارنس روڈ لاہور

سید عبد اللطیف مینیجر رسالہ ہمایوں نے مسلم پرنٹنگ پریس لاہور میں چھپوا کر شائع کیا